قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک ... فی پرچہ ... دوم (۳) فی پرچہ ۳؍

جلد (۸) دسمبر ۱۹۰۴ء نمبر (۳)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی۔ اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک مجموعہ

پشاور — کشمیر — لاہور — دہلی — لکھنؤ — کانپور — الہ آباد — بنارس — کلکتہ — بمبئی — حیدرآباد دکن — بنگلور — مدراس

مضامین نثر

دیباچہ غرۃ الکمال امیر خسرو۔ مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی ۱

ہندوستان۔ منشی حامد علی صدیقی سہارنپوری ۔ ۱۱

انسانی افعال اطاعت یا اردو دیوان جیمز ایلن کے پیٹرن سٹار ...

قرۃ العین۔ منشی نیاز احمد از میرٹھ ۔ ۲۳

کرشن جی۔ "اختر" دہلوی ۔ ۳۰

زندگی کی محبت۔ خواجہ لطیف احمد بی۔ اے ۳۸

اہل قلم کی اپیل۔ قلم باز خان ۔ ۴۲

مضامین نظم

جگنو
صبح کا ستارہ } شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ۴۴

وجد و سماع۔ حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی ۴۸

لمو دری۔ چودھری خوشی محمد بی۔ اے ۔ ۵۰

بارہ دری۔ سید علمدار حسین جونپوری ۵۴

تلاش محبت۔ میر نیرنگ بی۔ اے ۵۶

مرغ و صیاد۔ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۵۸

تازہ غزلیں ۶۲

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں ملک عبد العزیز مینیجر کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا

ایک نظر ادھر بھی دیکھ لیجئے

حضرات! یہ چند اشیا اپنے دواخانہ کی ناک چھانٹ کر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ آپ لوگ انکا ضرور تجربہ کیجئے فرق پڑے تو دو گنے دام دینے کا ذمہ ہے۔ پیشگی روپیہ آنے پر محصول بھی میرے ذمے ہے۔ ورنہ سب کو قیمت طلب پارسل کے ذریعے سے روانہ ہونگی۔

المشتہر

منشی امام الدین سوداگر دواخانہ انگریزی شہر متھرا

اثبات مسیحائی: علیا حضرت قیصرہ ہند کے خاص کیمیا ساز ڈاکٹر مسٹر برگامن کو فارماسوٹیکل سوسائٹی کے آنریبل میمبروں و گریٹ انٹرنیشنل اگزامینیشن پروفیسروں نے جو تمغے اور سارٹیفکیٹ دیئے ہیں ہر بوتل پر چھپا ہے اس لئے دعوی سے سفارش کیجاتی ہے کہ شربت فولاد دنیا کے تمام ایجاد شدہ ادویات کا بادشاہ۔ کمزوروں کا حاجت روا ہے۔ شربت فولاد کے ۲۰ قطرے روز پینے سے رگ پٹھوں و نظام عصبی یعنی دل و جگر و دماغ میں وہ تحریک اور طاقت پیدا ہوتی ہے کہ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ کل دماغی فعل قوی اور قوائے خمسہ ظاہری و باطنی تیز و روشن۔ چہرہ پر نور۔ دل میں فرحت و سرور۔ دوران خون میں تیزی و حرارت عزیزی میں ترقی غلبہ سرعت و ریح کی جودت سستی و کاہلی نابود۔ بھول چوک کا ذکر نہیں۔ خیالات مفید پیدا۔ ہاضمہ قوی کیفیت۔ بدہضمی کا نام نہیں۔ بھوک لا انتہا۔ کمر میں انتہا درجے کی طاقت۔ بوجہ تولید خون زندگی کا لطف۔ گردہ قوی۔ اعصاب سخت۔ ہڈی ہڈی مضبوط مستحکم ہو کر لاغر سے لاغر اندام شخص توانا تندرست۔ چاق چوبند ہو جاتا ہے۔ نزلہ۔ زکام۔ ریزش بلغم۔ درد گلو۔ درد سینہ۔ بدمزگی دہن۔ ہچکی زیادتی بلکل دفع ہو جاتی ہے۔ فی بوتل عا۔ تین بوتل صہ +

غازۂ یوسفی: جس طرح بال اور دانتوں کے صاف رکھنے کی ضرورت ہو اسی طرح چہرے کی صفائی اور نمائش بھی ضرور ہے۔ خوبصورت بننے کی دوا حضور شہزادہ پرنس اوف ویلز کی سفارش سے ڈاکٹر لانگڈیل صاحب نے مہاراجہ بیکانیر کیلئے تیار کی ہے جسکو سات روز تک نہانے سے کالی رنگت گلاب کی پتی کی طرح سرخ سفید مخمل کے مانند نرم ہو جاتی ہے۔ آنکھوں اور گالوں کے سیاہ داغ چھائیں۔ جھپ جھریاں۔ فوراً دفع ہو کر خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے سیتلا ماتا کے داغ خواہ کتنے ہی عرصے کے کیوں نہ ہوں ایک ہفتہ میں دفع ہو جاتے ہیں اور دھوپ وغیرہ سے جو چہرہ کھردرا اور بے رونق ہو جاتا ہے اسکو صاف کر چہرہ کو برابر صاف اور خوشرنگ نہایت ہی ملاحت دار کر دیتی ہے کہ دشمن کو بھی پیارا معلوم ہو جو خوبصورتی اور رنگت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ تمام عمر قایم رہتی ہے۔ بالکل بوڑھا بدشکل چہرہ جسپر جھریاں پڑی ہوں خوب صورت معلوم ہوتا ہے خوشبو ایسی کہ شہزادوں کے لایق استعمال۔ ایک دفعہ لگا کر جبتک دوبارہ غسل نہ کرو دماغ معطر ہے پسینہ کی بدبو بالکل گندہ۔ کھال کے کل عوارض۔ پھوڑا پھنسی۔ کھال کا ترخنا۔ داد خارش کو از حد مفید ہے۔ عطر و پاوڈر کو لگانا شوقین لوگ بھول جاتے ہیں نہایت ہی عمدہ ولایتی پھولوں کی روح کھینچکر اسکو تیار کیا ہے قیمت فی شیشی عہ تین شیشی للعہ +

میاں عبدالعزیز
شیخ عبدالعزیز
عبدالرشید
مرزا اعجاز حسین

مخزن

دیباچۂ غُرّۃ الکمال امیر خسروؒ

پر

ریویو

یہ امر مسلم ہے کہ خسروِ اقلیم سخن امیر خسروؒ کا خزانۂ کلام شمار سے باہر تھا۔ نسل تیمور کے ایک فرماں روا کے کتابخانے میں امیر ممدوح کے لاکھ سے زیادہ شعر موجود تھے۔ جب نئے کلام کی آمد موقوف ہوگئی تو اُس کو دعویٰ ہوا کہ اب اس سے زائد نہیں ہے اگر ہے تو کوئی لائے اور انعام لے۔ انعام کے شوق میں لوگ تلاش کر کر کے نئے نئے مجموعے لاتے جو آتا یہاں موجود ملتا۔ جب دعویٰ فیصلہ بن چکا تو ایک ضخیم جلد آئی جو شاہی کتابخانے میں نہ تھی۔ بادشاہ کو کوکبۂ خسروی کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اُس نے تسلیم کیا کہ امیر باکمال کا کلام حد شمار سے خارج ہے۔ داغستانی نے لکھا ہے کہ امیر خسروؒ کے تین دیوان ہیں۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیوٰۃ۔ غرۃ الکمال۔ لکھنؤ میں جو دیوانِ خسروؒ چھپا ہے اُس کے دیباچے میں فرماتے ہیں: "اب تک میرے چار دیوان ہو چکے ہیں۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیوٰۃ۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ یہ مجموعہ انہیں اربعہ عناصر سے صورت پذیر ہوا ہے۔ اس کے بعد جو کلام موزوں ہوگا وہ پانچواں دیوان ہوگا۔" خاکسار کو ایک قلمی مجموعہ ملا ہے جس کا نام نہایۃ الکمال ہے۔ جس میں دیباچہ۔ قصائد غزل وغیرہ سب کچھ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پانچواں

دیوان ہو۔ دیباچے میں اس کا ذکر نہیں کہ یہ کونسا دیوان ہے۔ اس کے سوا میرے یہاں ایک اور ضخیم قلمی نسخہ ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وُہ مستقل مجموعہ ہے یا عطرِ مجموعہ۔ لکھنوی نسخے کی بعض غزلیں اس میں ہیں (جو مختلف دیوانوں کی ہیں) لیکن اس کی بیسیوں غزلیں اس میں نہیں ہیں۔

تحفۃ الصغر ہاتھ آیا تو اُس کے دیباچے کا خلاصہ ناظرینِ مخزن کی نذر کیا گیا۔ اب خوبیٔ قسمت سے غرۃ الکمال کا دیباچہ دستیاب ہوا ہے۔ شوق کہتا ہے کہ اس کے جواہرات بھی مخزن کو بھیج اگرچہ جوہری سات سمندر پار علم کے موتی رولنے چلا گیا لیکن جواہر خانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ۵

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است

مے و میخانہ با مہر و نشان است

خدا اس خزانے کو معمور رکھے۔ غریب الوطن دوست کی نشانی ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال کے تئیس صفحے ہیں۔ عبارت اوّل سے آخر تک مرصّع اور رنگین ہے۔ مگر دربارِ خسروی کا یہ آداب ہے کہ مرصّع اور رنگین عبارت کا خلعت واقعات کو عطا ہوتا ہے۔ کارچوبی پوشاک خیالی پیکر کو نہیں پہنائی جاتی۔ حمد کے بعد نعت ہے نعت کے بعد پیر کی مدح۔ پھر سلسلۂ سخن یوں آغاز فرماتے ہیں کہ انسان کا سرمایۂ ناز نطق ہے۔ اور نُطق قدرتِ الٰہی کا برگزیدہ نمونہ۔ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ دیکھو بہرا اور گونگا چونکہ فیضِ سخن سے محروم ہے لہٰذا کسی بزم میں توقیر نہیں پاتا۔ طوطی اور شارک (مینا) حالانکہ جانور ہیں مگر انسانی کلام کی نقالی کی بدولت وُہ قدر پاتے ہیں کہ انسان کی خوش بیانی کی مثال اُن سے دی جاتی ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ کیجئے:۔

طُوطی عہ کہ حیوان غیر ناطق است بسببِ نطقِ عاریتی درجتے یافتہ است کہ اربابِ الباب جملہ فصحاء عالم و فضلاء عالم را نسبتِ سخن بر و میکنند و مدام قفسِ عزتِ اورا در بالین گاہ سرانِ و بابئین جائے سروران بآئینِ مکنت مکانے بلند ارزانی میدارند ....

عہ طُوطی جو ایک حیوان غیر ناطق ہے اُس کا درجہ عارضی گویائی کی وجہ سے اتنا بلند ہے کہ سارے عقلاء فاضلوں اور فصیحوں کی گویائی کو اس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور اسکا پنجرہ سرداروں کے یہاں سربلند ہے

۵ل

ودر سوادِ ہندوستان کہ خیالِ بہشت در آئین ہائے پرطاؤسان او بتواں دید۔ مرغیست کہ آں را شارک میگویند ودر خراسان سارو میخوانند۔ (واو مجہول) وایں خبر سار در طوطیانِ جہان طیران نمودہ کہ زبان آموزان ماہر چہرہ دہانش چنان باز میکنند کہ .... بسخن شیریں شکر خواری مے شود کہ پیشِ او بلبلاں راگاہ شکر خائی زبان شیریں در کام گرفتہ میگردد بلکہ سخن در دہان .... باز ہم در ...... ہندوستان زنار دارانند .... زبان ایشاں بر بیان منطق الطیر در افواہ افتادہ چنانچہ در معرفت بانگ زاغ کتاب ہا ساختند وچیزے از مغیبات از آں سواد میتوانند کہ بخوانند۔ واز تیزی زبان گنجشک بالقطع فالے میگیرند ومیگویند کہ بیشتر موافق ومقابل مے افتد و بعضے مردمان ناقص عقل کہ از مرتبہ عاقلی غافل اند ایشاں را بجہتہ بیان منطق مرغے کہ میگوید ونمیدانند کہ چہ میگوید شب و روز پرستش وپرستش میکنند و ہر روایتے کہ آں بیخبراں ازیں علم مے آرند آں جمع غیر سلامت وجوہ نحو آں میکنند وبتعلّم وتلمّذ بپذیرند۔

۵ل ملک ہندوستان میں جسکے طاؤس کے پر بہشت کا جلوہ دکھلا رہے ہیں۔ ایک جانور ہے جسکو شارک کہتے ہیں (مینا) اور خراسان میں اس کا نام سارو ہے۔ یہ امر تمام دنیا میں مشہور ہے کہ ماہر لوگ اسکو ایسی اچھی طرح بولنا سکھاتے ہیں کہ بلبل اس کے سامنے بولنا بھول جاتی ہے۔

ہندوستان میں ایک گروہ ہے جسکی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتا ہے۔ چنانچہ اُس نے کوّے کی آواز پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ جن سے وہ غیب کا حال بیان کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ چڑیا کی آواز سے شگون لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر ٹھیک اور سچ ہوتا ہے اور بعض بے عقل کہ جو اپنے مرتبہ سے ناواقف ہیں انکو جانوروں کی بولی سمجھنے والا سمجھکر رات دن انکی پرستش وپرستش میں مصروف ہیں حالانکہ جن جانوروں کی وہ بولی ہے اسکو وہ (جانور) خود نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ نافہم بک دیتے ہیں یہ بیعقل اس کی تاویل گڑھتے ہیں اور انکی شاگردی اختیار کرتے ہیں*

آگے یہ کہکر کہ انسان کیسا سادہ لوح ہے کہ باوجود نطق اصلی کے نقلی گویائی پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

قطعہ

گر بود بہتر زگفتِ آدمی گفتِ دگر — کے خدائے پاک مردم را خطابِ قُل کند
لیک نشناسد چو مردم قیمتِ گفتارِ خویش — فالِ میموں گیرد از پرندہ و غلغل کند
ناسپاسی میکند شاعر کہ با گفتِ چناں — ہر زماں وصفِ بیانِ قمری و بلبل کند
آرے آرے شاہ با چنداں خورش سرکہ خورد — خوب رویا آں چناں رخسارِ میلِ گل کند
نعمتِ کلّیت نطق و گر بداند قدرِ آں — جزو جزو بندہ شکر نعمت آں کل کند

فضیلتِ نطق ثابت کرکے اس کی دو قسمیں کی ہیں نظم و نثر۔ نثر پر نظم کی ترجیح کے جو دلائل لکھے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ موسیقی سا فن لطیف نظم کا محتاج ہے۔ نظم نہ ہو تو ریشم کے ساز کے نغمے بھی بے لطف ہیں۔ کلیات میں یہ مضمون کیسے پاکیزہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں قطعہ

مطربے میگفت خسرو را کہ ای گنجِ سخن — علم موسیقی زجنسِ نظم نیکوتر بود
زانکہ ایں علمیست کز دقّت نیاید در قلم — واں نہ دشوارست کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم — ہر دو را سنجیدہ بر وزنیکہ آں بہتر بود
فرق من گویم میان ہر دو معقول و درست — تا دہد انصاف کاں از ہر دو دانشور بود
نظم را علمے تصور کن بنفسِ خود تمام — کو نہ محتاجِ سماع و صوت خنیاگر بود
گر کسے بے زیر و بم نظمم فرو خواند رواست — نے بمعنی ہیچ نقصاں نے بلفظ اندر بود
ور کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں در سرود — چوں سخن نبود ہمہ معنی او ابتر بود
نائے زن را بیں کہ صوتے دارد و گفتار نے — لاجرم در قولِ محتاجِ کسے دیگر بود
پس دریں صورت ضرورت صاحبِ صوت و سماع — از برائے شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسی دان و نغمہ زیورش — نیست عیبے گر عروسِ خوب بے زیور بود

سلسلۂ بالا میں متقدمین شعرا میں مولانا رضی الدین نیشاپوری اور مولانا ظہیر الدین فاریابی کے علم و فضل

کی مدح کرتے ہیں اور متاخرین میں مولینا شہاب الدین حمرہ اور مولینا بہار الدین بخاری کی۔ اِس بحث کو ختم کر کے نظم فارسی و عربی کا موازنہ کیا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ عربی اپنی خوبیوں میں پارسی پر فائق ہے۔ لیکن نظم پارسی نظم عربی سے بہتر ہے۔ اور اس کی تین دلیلیں ہیں۔ اوّل شعر کی جان وزن ہے۔ اور اشعارِ فارسی کا وزن عربی نظم کے وزن سے زیادہ لطیف اور کامل ہے۔ کیونکہ جو زحف عربی شعروں کے وزن میں جائز ہے وُہ اگر فارسی شعر میں لے آئیں تو ناموزون ہو جائے۔ فارسی نظم ایک حرف بلکہ ایک حرکت کے تغیر سے غیر موزون ہو جاتی ہے۔ عربی نظم میں حرف بلکہ لفظ کا تغیر بھی کھپ جاتا ہے۔ جو خوبی وزنِ فارسی میں ہے عربی کیا عبری وغیرہ میں بھی نہیں۔ واقف کار جانتے ہیں۔ دُوسری دلیل۔ عربی زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے بے پایان ہے۔ ایک معنی کے لئے ہزار لفظ اور ایک لفظ کے لئے دس معنی۔ جس کے قبضے میں یہ خزانہ ہو وُہ کسی موقع پر تنگدست نہیں ہو سکتا۔ فارسی میں برعکس ہے۔ یہاں ایک لفظ کے ایک سے زاید معنے بہت کم ہیں۔ انصاف سے دیکھئے پارسیوں کو کس قدر دشواری نظم میں مطلب ادا کرنے میں ہے اور عربی دانوں کو کس قدر آسانی۔ تیسری دلیل۔ ہم عربِ عربا (خالص عرب) کے کلام سے بحث کرتے ہیں۔ وہاں قافیہ ہی قافیہ ہے۔ اگرچہ اہل فارس نے عربی نظم میں ردیف کو داخل کیا ہے۔ لیکن اُنکا کلام ٹکسالی نہیں۔ فارسی میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہے۔ اور ردیف نظم کے لئے سرمایۂ آرائش و زیبائش ہے۔ خلاصہ یہ کہ عربی شعر عرب میں کیا باعتبارِ وزن اور کیا بلحاظِ وسعتِ زبان و ترکِ ردیف ہر طرح آسانی ہے باایںہمہ خُوبی معنی کے لحاظ سے فارسی شاعری عربی شاعری سے بالاتر ہے۔ اس موقع پر یہ اعتراض نہیں کرنا چاہئیے کہ شعرِ عربی کا مرتبہ اس لئے بلند ہے کہ اُس سے کلامِ ربّانی کی تائید ہوتی ہے اور نہ یہ کہ خود کلامِ ربّانی اس زبان میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ میں یہ خود تسلیم کرتا ہوں کہ فارسی کلام اس مقام میں بمقابلہ عربی محض پوچ اور ہیچ ہے۔

درآں مقام کہ از شرعِ مصطفےٰ گویند نعوذ باللہ کہ از شاعری سخن رانم

لیکن یہ موقع شرعی بحث کا نہیں۔ ارباب معنی کو مضامینِ خاقانی کی بلندی۔ کلامِ انوری کی روانی۔
سیدِ حسن۔ نظامی و ظہیر کی نظم کا حسن پیشِ نظر رکھ کر انصاف فرمانا چاہیے۔ مقام دعویٰ سے مقام
انصاف میں آئیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم لطف زبان عربی کے قائل ہیں وُہ لُطف نظم فارسی کے
وزن کو مانیں۔ ایک لطیف کا مقابلہ دُوسرے سے ہو گیا۔ ہمارے یہاں خیالات بدیع ہیں۔
اُن کے یہاں تخیلات رفیع یہ دونوں بھی برابر ہے۔ ہمارے ردیف کے مقابلے میں وُہ کوئی
خُوبی پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا پارسی شعر کو فوقیت رہی۔ سلسلۂ کلام دراز ہو چکا۔ دیباچے میں
اس سے زیادہ گنجایش نہیں لیکن ایک مضمون جو دل میں چُبھ رہا ہے بے اختیار زبانِ قلم پہ
آتا ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ پارسیوں کو شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے عربوں پر ترجیح ہے۔
اگر عرب کا شاعر کامل و فصیح ملک فارس میں جائے۔ تو ممکن نہیں کہ وُہ زبان پارسی میں بات چیت بھی
صحیح اور درست طور پر کر سکے۔ معانی اہل فارس کا استنباط کرنا یا پارسی نظم و انشا پر قادر ہونا تو
دُوسری بات ہے۔ اس کے برخلاف پارسی کا شاعر اپنے مُلک میں عربی ادب و فضل حاصل کر کے
شعر عربی کہہ سکتا ہے بلکہ عربی الفاظ کو معانی پارسی سے ربط دیکر ایسا عُمدہ مجموعہ تیار کر سکتا ہے
کہ جو منصف مزاج دونوں مزوں سے واقف ہوگا وُہ بے اختیار احسنت کہہ اُٹھیگا۔ اور اگر شاعر
مذکور مُلکِ عرب میں جا پہنچے تو وہاں کے فصحا کو اُس کے علم و فضل کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ زمخشری[۵۱]
خوارزم کا باشندہ تھا عرب میں علامہ مشہور ہُوا۔ سیبویہ[۵۲] جو مجمل چھوڑ گیا تھا اُس نے مفصل کر دیا۔
ہندوستان کے باشندے طباعی میں تمام عالم سے بڑھے ہُوئے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہو کہ
عرب۔ خراسانی۔ تُرک۔ ہندو وغیرہ جو ہندوستان کے اسلامی شہروں میں (مثلاً دہلی۔ ملتان۔
لکھنوتی) نہ اُن شہروں میں جو ہندوؤں کے مرکز ہیں (مثلِ گجرات۔ مالوہ۔ دیوگیر) آئے اور تمام
عُمر یہاں کی زبان سیکھی ناممکن ہو کہ اُسکو صحیح اور درست بول سکے۔ اپنے ہی مُلک کے انداز پر گفتگو
کریگا۔ عرب عربی پر قادر ہوتے ہیں جب یہاں کی بولی بولتے ہیں بھرم کھُلجاتا ہے۔ ہند و خواہ

۵۱ علامہ زمخشری مُصنفِ تفسیر کشاف و مفصّل وغیرہ۔ ۵۲ نحو کا امام مشہور۔ جو اس فن کے موجدوں میں ہو۔

شہر کے باشندے ہوں خواہ گانو کے دہلی میں آکر رہتے اور زبانِ پارسی سیکھتے ہیں۔ لیکن ماہر ہرگز نہیں ہوتے۔ خراسانی۔ عراقی۔ شیرازی اور ترک کی جودت طبع زبان ہندی کے آگے سر جھکا دیتی ہے اور وُہ بیچارے ہر چند کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں مُنہہ کی کھاتے ہیں۔ جو اہل قلم ہندوستان کے اسلامی شہروں خصوصًا دہلی میں نشوونما پاتے ہیں۔ وُہ ہر مُلک کی زبان بولنے اور اُس میں نظم و نثر لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جس دیس میں پہنچ جائیں اُسی کی روش پر چل سکتے ہیں۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہو چُکی ہے کہ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے ملکِ عرب دیکھا بھی نہیں تاہم زبانِ عرب کو اس فصاحت کے ساتھ حاصل کیا کہ بُلغائے عرب اُن کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے۔ اور بہت سے تاژیک (مقابل تُرک جیسے عجمی مقابل عربی) میں[۱] نے دیکھے ہیں کہ اُنھوں نے زبانِ تُرکی ہندوستان میں سیکھ کر وُہ گویائی حاصل کی کہ اس گروہ کے فصحا اُن کی زبان سُنکر دنگ رہ گئے۔ زبانِ پارسی کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چند وُہ پارس سے یہاں آئی ہے لیکن سوائے ماوراءالنہر کے (جہاں کی پارسی ہندوستان کی پارسی کے مطابق ہے) کسی مُلک کی فارسی کے الفاظ درست نہیں۔ خراسانی "چہ" کو "چی" اور بعضے "کجا" کو "کجو" کہتے ہیں۔ کتاب میں دیکھو "چہ" اور "کجا" لکھا جاتا ہے اور الفاظ صحیح وُہی ہیں جو کتابی ہوں۔ اُن کے یہاں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اس کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ اِسکے برعکس ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ کے کنارے سے سمندر کے کنارے تک یکساں اور دری (خالص اور ٹکسالی) فارسی[۲] ہے۔ ہندوستان کی زبان[۳] کا یہ حال ہے کہ ہر سو کوس پر اور بولی ہے۔ پارسی اس

[۱] امیر خسرو کی مادری زبان ترکی تھی۔

[۲] آگے چلکر تم دیکھو گے کہ ملتان سے لیکر بنگالے کے انتہا تک امیر خسرو مختلف مقامات میں رہے تھے لہذا اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہو سُنکر لکھا ہے سُنی سُنائی بات نہیں لکھدی۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے اگرچہ عہد سُلطان محمُود سے (چوتھی صدی ہجری کے آخر میں) شروع ہو گئے تھے۔ لیکن مستقل سلطنت قطب الدین ایبک نے آغازِ صدی ہفتم میں قائم کی۔ امیر خسرو نے جس زمانے میں دیباچہ لکھا ہو وُہ ساتویں صدی کا آخری زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی سلطنت کا غایت اقتدار تھا کہ سو برس سے کم عرصے میں ٹکسالی فارسی پنجاب سے انتہائے بنگالہ تک مادری زبان بنگئی۔

[۳] معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چھ سو برس پیشتر بھی ہندوستان میں کوئی عام زبان نہ تھی اگر تھی تو فارسی تھی۔

چار ہزار کمی میل میں ایک ہی ہے۔ اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ گفتگو کتابی زبان کے مطابق ہے ... (اس مقام پر دیباچہ کی عبارت مشکوک ہے) کی طرح نہیں ہے جو کردہ "کو کردہ کن" اور "کردہ ہین" بولتے ہیں۔ نہ سیستانیوں کے مثل جو ہر لفظ کے آخر میں "ہیں" ضرور بڑھاتے ہیں جیسے "گفتہ ہیں"۔ اور "رفتہ ہیں"۔ ولائت کے آنے والے علما، و فصحا (عوام اور اوباش کا ذکر نہیں) دہلی کے فارسی کی مدح کرتے ہیں اور اہل دہلی انکی زبان پر ہنستے ہیں۔ یہاں کی زبان پر وہ گرفت نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہاں کی زبان "نرم و شستہ و لطیف و نظیف و درست و فصیحانہ" ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم سب کی بولی بولتے ہیں ہماری (موزوں) (ہاں)

۵ بولی کوئی نہیں بول سکتا۔ جو ہماری زبان پہ کلام کرے۔ اُس پر میر ابھی دیباجہ حجت ہو

گو بیاؤ بہ بین و دم درکش گردگر گوں بُود قلم درکش

اہل دہلی کی زبان کی خوبی جس کو تسلیم نہ ہو اُس کو میرے سامنے لے آؤ تاکہ اُس کا دعویٰ سر تسلیم خم کردے۔

اس سلسلے کے بعد لکھا ہے کہ شعر و سخن پر اس بُنیاد پر اعتراض کرنا کہ اُس میں ہجو و ذم وغیرہ مذموم مضامین ہوتے ہیں بجا نہیں، اس لئے کہ قابلِ مذمت یہ مضامین ہیں نہ نظم۔ کمال کی مدح سرائی میں سیف الدولہ اور متنبی کا یہ لطیف لطیفہ درج کر گئے ہیں۔ مشہور ہے کہ سیف الدولہ متنبی کے سامنے شعرا کی فلاکت اور بے سر و سامانی پر طعن کر بیٹھتا تھا۔ اور مال کی بحیثیت مربی کمال ہونے کے تعریف کیا کرتا تھا۔ ایک روز سیف الدولہ حمام میں تھا متنبی کو بھی بلا بھیجا۔ دونو لنگی باندھے ہوئے تھے۔ خلوت تھی اور امیر کی طبیعت شگفتہ۔ زندہ دل شاعر کو فی البدیہ ایک مضمون سوجھا۔ عرض کی کہ جہاں پناہ اسوقت آپ کی اور بندے کی یہ حالت ہے کہ سوائے ایک لنگی کے کچھ پاس نہیں۔ متنبی تو اب بھی متنبی ہے۔ مگر حضور ذرا غور فرمائیں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ سیف الدولہ متنبی کی سیف زبانی سے کٹ گیا اور بل کھا کر کہنے لگا "اَنسِیتَ قِربَتَکَ" یعنی کیا تو اپنی مشک بھول گیا (متنبی کی نسبت مشہور ہے کہ سقا تھا) متنبی نے برجستہ کہا "اَنسَانِی قُربُکَ" یعنی آپکے تقرب نے بھلا دی۔ جواب کی آبداری غصے کی جلتی آگ پہ پانی کا کام کرگئی۔ شعرا کی تین قسمیں

قائم کی ہیں - اوّل صاحب طرزِ خاص وجدید - جیسے حکیم سنائی - انوری - ظہیر و نظامی - چونکہ خاقانی مجیر (بیلقانی) کا اور کمال اصفہانی رضی الدین نیشاپوری کا اور سوزنی مسعود سعد سلمان کا تتبع کرتے ہیں اس لئے اس قسم سے خارج ہیں - دوم جو متقدمین یا معاصرین میں سے کسی کی طرز کے پیرو ہوں - سوم جو پرائے مال کو تاکیں - اوّل اُستاد ہیں دُوسرے شاگرد تیسرے غارتگر - جس باکمال میں چار شرطیں جمع ہوں وُہ اُستاد مانا جائیگا - پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی طرز اَوروں سے ممتاز ہو - دُوسری یہ کہ اُس کے کلام کی عذوبت و سلاست شعرا کی طرز پر ہو نہ واعظوں اور صوفیوں کے انداز پر - تیسری یہ کہ کلام خطا سے پاک ہو - اور چوتھی یہ کہ اِدھر اُدھر کے پیوندوں سے اپنا مرقع آراستہ نہ کرے یعنی اَوروں کے مضامین نہ اُڑائے - شاگرد تین طرح کے ہوتے ہیں - شاگرد اشارت - شاگرد عبارت اور شاگرد غارت - شاگرد اشارت کی یہ صورت ہے کہ مبتدی کا شعر وزن میں گر جائے یا مضمون خبط ہو جائے - تو اُستاد دانا اشارہ کر دے کہ اسکو یُوں درست کرو اور یُوں باندھو[1] - یونہی اشاروں اشاروں میں مبتدی فن کی باریکیاں سمجھنے لگتا ہے - شاگردِ عبارت وُہ مبتدی ہو کہ اُستادوں کی پیروی کرے اور اُن کے کلام میں جو لفظ اور معنی دیکھے اُنکو اپنے کلام کا نمونہ قرار دے - شاگرد غارت وُہ حریف ہیں جو خود کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر مصنف بننے پر مرتے ہیں - یہ لوگ اُستادوں کے خزانے سے مال نکال کر اپنے ویرانے میں رکھتے اور دُوسروں کے قطرہائے خون کو اپنا جگر گوشہ بتاتے ہیں - خدا ایسے بےشرموں کے شر سے بچائے - یہ نہ سمجھنا کہ اُستادی اور شاگردی کی بحث میں نے اس لئے اُٹھائی ہے کہ مجھ کو اُستادی کا دعویٰ ہے - حاشا - میں نے جو شرطیں اُستادی کی قرار دی ہیں اُن میں سے بعض مجھ میں موجود نہیں وجہ یہ کہ میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں اور وُہ اربعہ عناصر سے مرکب ہے - وعظ اور حکمت پر جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس میں سنائی وخاقانی کی پیروی کی ہے - اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہے - جو عالم بالا کی طرف میل رکھتی ہے - تخلص (قصیدہ) اور خلاصہ خیال میں طرزِ رضی وکمال اختیار کی ہے جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جلتی ہے - غزل اور مثنوی میں سعدی و نظامی کے

[1] معلوم ہوا کہ اصلاح کی انتہا یہی حد ہے ۱۲

قدم بہ قدم ہوں - اِس روش کو بلحاظِ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہے - میرے کلام کا حصّہ مقطّعات - رباعیات معمّا و لُغز خود میرے وجُود خاکی کا غبار ہے - جو اس لحاظ سے خاک ہے کہ اُس میں بہت سے جواہرات چھپے ہوُئے ہیں - میری نثر بھی میری ہی طبیعت کا جوہر ہے اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنُونِ احسان نہیں ہوں - خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اُستادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحبِ طرزِ خاص ہونا مجھ میں موجُود نہیں - مَیں خود کہہ چکا ہوں کہ مَیں نے بہت سے اساتذہ کا تتبّع کیا ہے - دُوسری شرط کہ کلام خطا اور قصوُر سے پاک ہوا اور اسکا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں - بندے کی نظم اگرچہ رواں ہے لیکن غزل اور لغز (چیستاں) میں جا بجا لغزشیں بھی ہیں ("نظمِ بندہ اگرچہ بیشتر رواںست امّا جا بجا در غزل و لُغز لغزیدنی ہم ہست") دونوں مذکورۂ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہے کہ پایۂ اُستادی تک میری رسائی نہیں - رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو نہ واعظانہ و صوفیانہ - مجھ کو دعویٰ ہے کہ میرا کلام شاعرانہ ہے صوفیانہ اور واعظانہ نہیں ہے - چوتھی شرط کہ مرقع دوزی نہ ہو یہ بھی مجھ میں موجُود ہے مَیں نے آج تک دُوسروں کے متاع نہیں تاکے - قصّہ مختصر مَیں مالکِ طرزِ خاص نہیں - خطا سے میرا کلام پاک نہیں - میرا کلام اسلوبِ شُعرا کے مطابق ہے سرقہ مَیں نے نہیں کیا - بس اُستادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں دو نہیں ہیں - مَیں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سندِ اُستادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے

ع ناتمام ناتمام ناتمام ✤ (باقی آیندہ)

دربار نمبر :- جو دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا - اِس کے مضامین بجائے ۵۶ کے ۹۶ صفحہ پر آئے تھے - اور اُسے نہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا - اس کی کچھ زائد کاپیاں رکھی ہیں - جن حضرات کو شوق ہو - طلب فرمائیں - اس میں کئی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں - قیمت ۱ر بذریعہ رسیل ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی پی طلب کیجئے ✤ **مینیجر مخزن**

ہندوستان

(۱)

اگر تم کسی طرح ہوا میں اتنے اُونچے پہنچ جاؤ جتنا اُونچا عقاب اُڑتا ہے اور پھر وہاں سے مُلک ہندوستان پر نظر ڈالو تو تمہیں ایک بڑا لمبا چوڑا زمین کا قطعہ بحر ہند کی طرف پھیلتا ہُوا دکھائی دیگا۔ شکل میں یہ بہت کچھ مثلث سے ملتا ہے۔ مثلث کہتے ہیں تکونی شکل کو۔ اس کے پُورب کے کونے سے ایک اور ٹکڑہ خشکی کا دکن کی طرف کچھ دُور سمندر میں نکلا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ صوبہ برہما ہے۔ اسی طرح پچھم کی طرف بھی خشکی کا کچھ حصّہ آگے کو نکل گیا ہے۔ یہ صوبہ سندہ ہے۔ اگر ادھر سے سندہ اور اُدھر سے صوبہ برہما ہندوستان کی سرزمین سے تراش دیئے جائیں تو پھر یہ ہُو بہو مثلث معلوم ہوگا جسکی چوٹی سر اس کماری سمجھو۔ مثلث کی چوٹی اُوپر اُتر کی طرف ہُوا کرتی ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ لو کہ یہ اُلٹا مثلث ہے۔ جسکی چوٹی نیچے دکن کی طرف ہے۔ اگر اس مثلث کی اُتر کی طرف دیکھو تو تمہیں اس سرے سے اُس سرے تک ایک بڑا بھاری سلسلہ پہاڑوں کا دکھلائی دیگا۔ یہ ۱۶۰۰ میل لانبا ہے اور ہمالیہ پہاڑ کہلاتا ہے۔ یہ ساری دنیا کے پہاڑوں سے بڑا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے اس کے کتنے ہی حصّے ہیں۔ ان میں مشہور یہ ہیں۔ پورب کی طرف نیپال۔ سکم۔ بھوٹان یہ تینوں خودسر ریاستیں ہیں۔ اور پچھم کی طرف کماؤن - گڑھوال۔ المورڑہ۔ نینی تال۔ شملہ۔ ڈلہوزی۔ چمبہ۔ کاشمیر۔ ہمالیہ کی بعض چوٹیاں اتنی اُونچی ہیں کہ بادلوں کے تختے سے بھی اُونچی نکل گئی ہیں۔ اور ان پر بارہ مہینے برف جمی رہتی ہے۔ جیسے کنچن جنگا۔ دھولگرہ۔ ایورسٹ۔ یہ زمین سے کوئی ۲۹۰۰۰ فیٹ یا کچھ کم دس ہزار گز اُونچی ہے۔ اور سدا بادلوں میں چھپی رہتی ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کے ہونے سے تمہیں یہ فائدہ ہے کہ اگر کوئی غنیم اُتر کی طرف سے تمہارے مُلک پر حملہ کرنا چاہے تو ہمالیہ کی یہ لوہا لاٹھ دیوار اُسے ایک قدم بھی نہیں بڑھنے دیگی۔ ہمالیہ پربت کے بیچوں بیچ۔ دھولگرہ کی چوٹی ہے جو ۲۸۰۸۰ فیٹ یا کچھ کم ۹۴۰۰ گز اُونچی ہے۔ اگر تم دھولگرہ سے دکن کی طرف سیدھے نظر دوڑاؤ تو راس کماری

تک پہنچنے میں کوئی دو ہزار میل کا راستہ طے کرنا پڑیگا۔ لیکن اس راستے میں افریقہ کے سے نرے گرم خشک۔ اُجاڑ ریگستان ہی نہ ملینگے۔ کہ انہیں دیکھ کر وحشت ہو۔ نہ کہیں مُلک رُوس کے سے صرف بنجر اور چٹیل میدان سُوجھینگے۔ بلکہ دھولگڑھ کی ہیبت ناک اُونچائی سے اُترتے ہی ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم ایک پھلے پھُولے باغ میں داخل ہو رہے ہو۔ پہاڑ کے دامن سے تھوڑی دُور چلکر وُہ سرزمین آتی ہے جس میں سے گنگا ہو کر گذرتی ہے اور پورب دکن کے رُخ بہتی ہوئی خلیج بنگالہ میں جاگرتی ہے۔ گنگا کے پانی کی بدولت یہ علاقہ بڑا سرسبز اور پیداوار کا ہے۔ یہاں طرح طرح کے پھل پھُول اور غلے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وُہی سرزمین ہے جہاں ہزاروں برس ہُوئے کہ آریہ قوم اُتر پچھم کے کھونٹ سے ہندوستان میں داخل ہو کر دریا کے کنارے آباد ہوئی تھی۔ وُہ اس علاقے کو آریہ ورت کہتے تھے۔ اور جغرافیہ میں اس کو وادی گنگا کہتے ہیں۔ گنگا کے علاوہ ایک اور بڑا دریا پورب کی طرف ہمالیہ پہاڑوں سے بہتا ہوا خلیج بنگالہ میں گرتا ہے۔ یہ برہمپتر ہے۔

برہمپتر کی وادی بھی اتنی ہی سرسبز ہے۔ اسی طرح پچھم کی طرف ایک اور بڑا دریا ہے جو اُتر پچھم کے کونے سے بھکر اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو ساتھ لیکر مُلک سندھ میں داخل ہوتا ہے اور پھر یہاں سمندر میں جاگرتا ہے۔ یہ دریائے سندھ ہے۔

برہمپتر۔ گنگا۔ سندھ ان تین دریاؤں کے سبب ہندوستان کا اُتر کا حصہ ایک گل گلزار بنگیا ہے۔ جس میں طرح طرح کی قدرتی نعمتیں موجود ہیں۔ الغرض دھولگڑھ کی چوٹی سے اُتر کر اور پہاڑ کے دامن کو طے کر کے تمہاری نظر اس وادی گنگا کی سیر کرے گی۔ پھر بندھیاچل پہاڑوں کا سلسلہ دیکھیگا۔ یہ سلسلہ ہندوستان کی پُرفضا زمین کے بیچ میں اس طرح واقع ہے جس طرح کوئی آدمی نفیس لباس پہنکر کمر میں ایک خوبصورت پٹکہ باندھے۔ بندھیاچل کی اونچی نیچی چوٹیوں اور بڑی بڑی گھاٹیوں سے گذر کر تھوڑا ہی آگے بڑھنا پاتے ہیں کہ ایک دُوسرا پہاڑی زنجیرہ پیش آتا ہے۔ یہ ست پُڑا ہے۔ اور سرسبزی و شادابی میں بندھیاچل پہاڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ دونوں کے بیچ کا علاقہ دریائے نربدا کی وجہ سے نہایت ہی ہرا بھرا ہے۔ یہ پُورب سے پچھم کو بہتا ہوا خلیج کھمبائت میں جاگرتا ہے۔ جہاں ست پُڑا پہاڑ کا

دامن ختم ہوتا ہے وہیں سے ملکِ دکن شروع ہوجاتا ہے - اسکو جزیرہ نمائے ہند بھی کہتے ہیں - اس علاقے میں بھی دو مشہور دریا ہیں یعنی گوداوری اور کشتنا جو پچھم سے پورب کی طرف سرزمینِ دکن کو مالا مال کرتے ہوئے کارومنڈل گھاٹ پر سمندر میں جا گرتے ہیں - عقاب کی اونچائی سے تم شہر اور قصبے نہیں دیکھ سکتے - کیونکہ یہ چھوٹی چیزیں ہیں ملک کی بڑی اور اُبھری ہوئی چیزیں پہاڑ اور گھاٹیاں اور دریا اور میدان ہی ہیں - یہ ایسے ہیں جیسے کسی آدمی کے چہرے پر آنکھ - ناک - کان خاص دکن سے راس کماری تک کوئی اُبھری ہوئی چیز نہیں سوجھتی - البتہ مالابار گھاٹ کے برابر اُتر دکن میں ایک لمبا سلسلہ پہاڑوں کا چلا گیا ہے جو کچھ کچھ ایسا ہے جیسے سمندر کی زبردست موجوں کے تھپیڑ سہنے کے لیئے پتھروں کی ٹکر یا سدِ آب بنا لیتے ہیں - یہ نیلگری پربت ہے - اسی طرح کارومنڈل گھاٹ پر بھی دور دور تک ریت کے بیابان اور اوپر چلکر خلیج بنگالہ کے قریب دلدل پھیلی ہوئی سوجھتی ہے - اگر مالابار اور کارومنڈل کو دکن کی دامن سمجھیں تو اُدھر نیلگری پربت کا زنجیرہ اِدھر ریت اور دلدل کا سلسلہ ان دامنوں کی سنجاف ہیں - اُتر کی طرف اگر ہمالیہ پربت تمہیں غنیم کے حملے سے بچائیگا تو دکن کی طرف نیلگری پربت کی سنگین دیوار اور ریگستان دشمن سے محفوظ رکھینگی - اِس طرح ہندوستان اُن قدرتی فصیلوں کی وجہ سے گویا ایک قلعہ بند شہر ہے - وہ کونسی قدرتی خوبی ہے جو ہمارے ہندوستان میں نہیں ہے - پہاڑ اتنے اونچے اونچے اور لمبے کہ یورپ کا الپس پہاڑ بھی اُن کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے - بعض چوٹیاں اتنی اونچی معلوم ہوتی ہیں کہ انسانی قدموں نے آج تک اُنکو چھوا نہیں اور نہ کبھی چھوئینگے - میدان ایسے سرسبز - ہموار اور ایسے لمبے چوڑے کہ اگر اُنکو زمرد کے بحیرے سے تشبیہہ دیجائے تو بجا ہو - جہانتک نگاہ کام کرتی ہے گویا سبز مخمل کا فرش پھیلتا چلا جاتا ہے اور آخر کو اُفق میں چھپ جاتا ہے - مالابار جیسے وسیع گھاٹ جس پر پہاڑوں کا زنجیرہ کھنچا ہوا ہے یہ سمندر کے نیلگوں پانی کی موجوں کو اوپر نہیں اُٹھنے دیتا - کیونکہ سمندر کی طرف زمین ڈھلوان ہوتی گئی ہو - سال میں جتنا مینہہ یہاں برستا ہو اتنا دُنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں برستا - وہ وہ چٹیل اور بنجر میدان ہیں کہ افریقہ کے صحرا بھی اُنکے آگے گرد ہیں - جنگل ایسے گنجان اور وسیع کہ

اُتھنیوں کا پتہ نہیں لگتا۔ جیسے کجلی بن جس میں لکھو کھا درخت اور بلید ار جھاڑیاں سینکڑوں پیچ خم کھا کر زمین سے بلند ہوتے ہیں۔ یہاں کے دریا اگرچہ لمبائی چوڑائی اور شان میں مصر کے رود نیل اور امریکہ کی مس سپی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر ملک کو سرسبز کرنے اور عام فائدہ پہنچانے میں ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جیسے برہم پتر اور دریائے گنگا اپنے معاونوں سمیت باغ ہندوستان کے پورب کی طرف کے حصّے میں پانی دیتے ہوئے خلیج بنگالہ میں گرتے ہیں اور دریائے سندھ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو ساتھ لئے اس باغ کے پچھم کے حصّے کو سینچتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ اسی طرح نربدا۔ تاپتی اور مہاندی وسط باغ کی آبیاری کرتے ہیں اور گوداوری اور کشنا دکن کے حصّے کو سیراب کرتے ہیں۔ خیال کرو کہ یہ دریا سالانہ کتنے کروڑ من ریت اور مٹی سرزمین ہند سے بہا کر سمندر میں لیجاتے ہونگے۔ ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا تو ناممکن ہے۔ لیکن علم طبقات کے عالموں نے تخمینہ لگایا ہے کہ اگر ایک ہزار جہازوں کا بیڑا بنایا جائے اور ہر جہاز اتنا بڑا ہو کہ ۳ ہزار ٹن (۲۸ من = ٹن) بوجھ اُٹھا سکے تو جتنا ریت مٹی یہ تمام بیڑا لیجائیگا اتنا ہی ریت ایک سال میں ہندوستان کے دریا سمندر میں بہا کر لیجاتے ہیں۔ پیداوار کے اعتبار سے دیکھو تو بھی ہندوستان دُنیا کے کسی ملک سے کم نہیں۔ ایک ایک کر کے تو گننا مشکل ہے لیکن خلاصے کے طور پر یہ بتلایا جاتا ہے کہ دُنیا کے تمام حصّوں میں سے صرف اُن حصّوں کی پیداوار جو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے آس پاس ہیں یا سمندر کے ایسے گھاٹ پر ہیں جہاں آج تک انسان نہیں پہنچا۔ اُن پیداواروں کے سوا اور تمام رُوئے زمین کی پیداوار ہندوستان میں موجود ہے اور اگر نہیں ہے تو پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین میں ہر طرح کی پیداوار کی صلاحیت ہے۔ ہر طرح کا غلہ۔ گیہوں سے لیکر جو اکثر اونچان میں پیدا ہوتا ہے اور چانول تک جو ہمیشہ دلدل میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے بنگالہ یا دکن کے آس پاس کی زمین جو نچان میں ہے۔ ہر قسم کے میوے۔ لنگا کی سیب سے جو پہاڑی زمین میں پیدا ہوتا ہے اور انبہ اور امرود تک جو گرم سرزمین میں پیدا ہوتا ہے۔ ہر طرح کے پالو جانور (چوپائے) بیل اور کُتے سے لیکر اُونٹ اور ہاتھی تک ہر قسم کے خونخوار جانور شیر۔

بھیڑیا - بھگرا - شکاری جانور جیسے چیتا - ہر طرح کی کھالیں اور ہر طرح کے سمور سنجاب - شیر اور ریچھ سے لیکر بکری تک قسم قسم کے مویشیوں کے چمڑے جو بڑے قیمتی اور کارآمد ہوتے ہیں - ہر طرح کی اون اور پشم پہاڑی بکروں سے لیکر لومڑی تک - ان میں بعض ایسی ہیں کہ اگر یورپ کی مشہور لیڈیوں میں لیجاؤ تو بڑی بڑی پرکھنے والی نہ بتا سکیں کہ کیا ہے کیونکہ وہاں اب تک ان کو کوئی جانتا بھی نہیں - ہر طرح کی رسّی بٹنے کے درخت ریشہ دار - لگا کی سن - پتوارے - بانس - کیوڑہ اور ناریل تک اسی پتوار کی بنی ہوئی چیزوں کی بڑی شہرت ہے - ہر قسم کے تیل کے درخت ناریل سے لیکر جس کے تیل سے مومی بتیاں بنتی ہیں اور عطر گلاب تک جو سونے کے تول تُل کر بکتا ہے - ہر طرح کے رنگ روغن نیل سے لیکر لاکھ تک اور اس کے علاوہ سینکڑوں ہزاروں رنگ پیدا ہوتے ہیں - نیل خاصکر مشہور ہے - یہ ہندوستان کے اُتر کے ملکوں میں پیدا ہوتا ہے اسکی تجارت زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہی یہاں سے دُوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں - چنانچہ ان ممالک میں نیل کی تجارت کرنے والے انگریزوں کا ایک بڑا گروہ بن گیا ہے - ہر قسم کی منشیات اور مفرحات - افیون سے لیکر آسام اور دنیا کی کافی چاؤ تک ان میں افیون بڑے نفعے کی چیز ہے - کیونکہ چینی اس کے بہت شایق ہیں اور اس کے بدلے میں ہمیں چینی چاء دیتے ہیں جو بڑی اچھی اور مزے دار چاء ہوتی ہے - اس کے علاوہ ہر طرح کے مصالحے - خوشبویات - بخورات - ادویات - ہر قسم کے شہتیر اور کارآمد لکڑیاں ہمالیہ کی دیودار سے لیکر ساگون تک جو جہاز بنانے کے کام میں آتی ہیں - اور شیشم سال سے لیکر صندل تک - ہر قسم کے بانس جو طرح طرح کے کام میں آتے ہیں - ہر قسم کی دھاتیں - سونے سے لیکر اچھے سے اچھے لوہے تک - ہر طرح کے پتھر - سنگ خارہ - سنگ ابرک - سنگ مرمر - اور اور قیمتی پتھروں سے لیکر لعل و یاقوت - رمان - ہیرا - زمرد - پکھراج - نیلم اور یشب تک - ان کے علاوہ اور صدہا طرح کے نگ جن کے رنگ کو کسی چیز سے تشبیہہ دیکر وہی نام اُن کے رکھدئے ہیں - مثلاً گربہ چشم کیونکہ اس نگ کا رنگ کچھ کچھ بلی کی آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب انگوٹھی میں جڑا جاتا ہے تو ہو بہو بلی کی آنکھ معلوم ہوتا ہے - آبادی کے لحاظ سے ہندوستان بڑا غدّار ملک ہے قریباً ۲۸ کروڑ باشندے ہیں - گویا انگلستان خاص اور صوبہ ویلز کی معمولی آبادی سے دس گنا زیادہ آباد ہے - اگر اس کی آبادی کے پانچ حصے

برابر کئے جائیں تو اُن میں سے صرف ایک حصہ آبادی کا ایسا ہے جو حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی رعیت نہیں۔ باقی چار حصے زمین کے رعیت ہیں۔ ملک معظم کی حکومت میں اس قدر ملک ہیں کہ دُنیا میں جدھر سُورج گھومتا ہوا جاتا ہو اُدھر کچھ نہ کچھ حصہ زمین کا تاج برطانیہ کے ماتحت ضرور ہوتا ہے۔ ان میں اگر کوئی مُلک ایسا ہو جس پر دولت برطانیہ کو بڑا ناز ہے تو وُہ صرف ہمارا ہندوستان ہی ہو۔ اور مقامات ایسے ہیں کہ برطانیہ کے تاج میں گوہر ہیں اور ہندوستان ایسا ہے کہ گویا ان سب میں گوہر شب چراغ ہے۔ یورپ کے تمام بادشاہوں کو ہمیشہ سے یہ آرزو رہی کہ وُہ ہندوستان کو اپنا بنا لیں۔ پندرھویں صدی کے اخیر میں شاہ ھسپانیہ کی طرف سے کلمبس نے ہندوستان کی تلاش میں بحرِ ظلمات کنگھالا۔ لیکن پتہ نہ ملا۔ پھر اَور من چلے فرنگیوں نے سمندروں میں جہازرانی کی۔ کسی نے کہا ہم اتر پورب کے کھونٹ سے ہندوستان کا راستہ نکالینگے۔ کسی نے کہا ہم اُتر پچھم کی راہ نکالینگے۔ واسکوڈی گاما نے براعظم افریقہ سے گھومکر پہلا راستہ پیدا کیا۔ ولندیزوں نے بھی قدم جمانے کے لئے اپنے سے بہت کی۔ فرانسیسیوں نے تو جنوبی ہندوستان کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ لیکن اخیر کو پالا انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور ہندوستان دولت برطانیہ کی مضافات میں داخل ہو گیا۔ ہم نے اب تک ہندوستان کی موٹی موٹی باتیں بتلائی ہیں اور باہر سے جو چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں صرف وُہی دکھلائی ہیں۔ آؤ اب ہندوستان کی اندر سے سیر کریں۔ اُسکے خوشنما شہروں اور اسکی مشہور عمارات کو دیکھیں۔ ریلیں اس زمانے کی شاہراہیں ہیں اور وہ بڑے بڑے قصبوں۔ شہروں سے گذرتی ہیں۔ آؤ ان میں سے کسی بڑی ریل میں سوار ہو کر ہندوستان کا سفر کریں۔ کلکتہ اور بمبئی دو بڑے بڑے شہر ہیں۔ یہاں بندرگاہیں بھی ہیں اور یہاں سے تمام اطراف میں ریلیں جاتی ہیں۔ بہتر ہو کہ ہم اپنی سیاحت بمبئی سے شروع کریں۔ لیکن خشکی کی راہ سفر کرکے کنارے کے حالات معلوم نہیں ہو سکتے۔ کنارے یا ساحل یا گھاٹ پر مشہور آبنائے ہوتی ہیں۔ خلیجیں۔ کھاڑیاں۔ راسیں۔ جزیرے۔ بندرگاہیں ہوتے ہیں اور یہ بھی ملک کے جغرافیہ کے ابھرے ہوئے خط و خال ہیں۔ انکا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اسلئے بہتر ہے کہ اوّل ایک تری کا سفر بمبئی سے کلکتہ کو کریں اور کارومنڈل گھاٹ کے پاس پاس ہو کر چلیں کیونکہ بمبئی سے آگے مالابار گھاٹ اتنا آباد نہیں ہے اور نہ کراچی کے سوا اُس پر اور کوئی شہر قابل ذکر واقع ہے +

اِنسانی افعالِ اطاعت

یعنی

ڈالی - سلام - خوشامد پر ایک نظر اصُولِ ارتقاء کے لحاظ سے

جس خوش اسلوبی سے حکیم ہربرٹ سپنسر نے قانون ارتقاء کے عمل کو تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دکھایا ہے ناظرین کو اسکا اندازہ اس دلچسپ مضمون کے پڑھنے سے ہو جائیگا جو ہمارے مکرم دوست لالہ دیوان چند بی - اے پلیڈر نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔

اِنسان کے جملہ افعال دو قسم کے ہوتے ہیں - اوّل وُہ جنکا مقصُود اسکی اپنی ذات ہے - دوئم وُہ جنکا تعلق دیگر افراد سے ہے -

مؤخر الذکر کی دو اقسام ہیں - افعالِ محبّت و افعال اطاعت -

جو افعال بوجہ اُلفت - شفقت - عنایت یا رحم وغیرہ کیئے جاتے ہیں (اور وُہ بے شمار ہیں مثلاً محبت - پیار - بوس و کنار - مصافحہ کرنا - بغلگیر ہونا - گلے لگانا - دُوسرے کو دیکھ کر خوشی میں اُچھلنا کودنا - نعرے مارنا - بغلیں بجانا - ہبہ - بخشش - تحفہ وغیرہ وغیرہ) یہ سب افعالِ محبّت کی قسم میں داخل ہیں - ان سب افعال کا مدّعا یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کی پسندیدگی کا اظہار ہو - ان کو چھوڑ کر باقی تمام افعال افعالِ اطاعت میں داخل ہیں - اگر لفظ اطاعت کو وسیع معنوں میں لیا جاوے - ان افعال کا مدعا اظہار پسندیدگی کے بجائے حصُولِ خوشنودی یا رضامندی ہوتا ہے -

حیوانات میں بھی افعالِ اطاعت دیکھے جاتے ہیں - مثلاً ایک کُتا مالک کو خفا دیکھ کر - دُم کو دباتا - دبک کر - سہم کر - آہستہ آہستہ لیٹتا لیٹتا اور اطاعت کی دیگر علامات دکھلاتا ہُوا - مالک کے پاؤں میں آجاتا ہے - اور اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیتا ہے - علیٰ ہذا القیاس جب وُہ ایک مضبوط و زبردست کُتّے کو حملہ آور دیکھتا ہے - اور تاب مقابلہ نہیں رکھتا اور یہ معلوم کرتا ہے کہ دانت نکال کر بچاؤ پر کھڑا رہنا بھی لاحاصل اور خلافِ مصلحت ہے - تو پیٹھ کے

بل گر کے - ٹانگیں اُوپر کر کے - مسکین شکل بنا کر آگے لیٹ جاتا ہے - اور قدرے دردانگیز طور پر غرّاتا شروع کرتا ہے - گویا تمام ہتھیار وغیرہ ترک کر کے پُورے طور پر اطاعت قبول کرتا ہے تاکہ جاں بخشی ہو اور حملے کے نقصان سے بچے - اسی قسم کے دیگر افعال اطاعت کُتّے اور نیز دیگر حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں - جن کا ذکر اگرچہ خالی از لُطف نہیں - مگر انسانی افعال اطاعت کے مضمون سے باہر ہیں۔

اِنسانی افعالِ اطاعت کی تین موٹی اقسام ہیں :- ڈالی - سلام - خوشامد -

ڈالی یعنی قسم اوّل میں وُہ افعال داخل ہیں جن کے ذریعے سے کوئی چیز اپنی ذات سے علیحدہ کیجاوے اور دُوسرے کو دیجاوے تاکہ لینے والا خوش ہو -

افعال قسم دوم میں بھی اگرچہ اندرونی خیالِ اطاعت کا اظہار مقصود ہوتا ہے - لیکن اپنے سے کوئی چیز علیحدہ نہیں کی جاتی - صرف اعضاء بدنی کی حرکات پر اکتفا کیا جاتا ہے - یہ سلام ہو -

قسم سوم خوشامد ہے - یہ صرف لفظی جمع خرچ ہے - نہ اپنے سے کوئی چیز علیحدہ کی جاتی ہے - نہ بطور بیرونی علامت کے بدن یا بدن کے کسی حصّے کو جُنبش یا حرکت دیجاتی ہے - صرف "زُبان ہزار نعمت ہے" کے مسئلے پر عمل کر کے دُوسرے کی تعریف - بڑائی - صفت و ثنا کر کے اسکو خوش کیا جاتا ہے - یا دُوسرے کے مقابلے میں اپنا عجز ظاہر کر کے ٹیڑھے طریقے سے اس کی عظمت ظاہر کی جاتی ہے -

ترقی تمدّن کے مختلف مراحل میں یہ تین افعال مختلف ناموں - اور مختلف لباسوں میں نظر آتے ہیں - اور جو تبدیلیاں ان ابتدائی افعال کے نام یا صُورت میں ہوئیں وُہ ضرورتِ تمکنی کی وجہ سے یکے بعد دیگرے ایک قابلِ فہم قدرتی سلسلے میں واقع ہوئیں - اور اگر غور سے دیکھا جاوے تو مذہب میں بھی ڈالی سلام خوشامد کی رسم پائی جاتی ہے - اور بعض موجودہ رسُوم و عقاید کی بُنیاد میں یہ تین ابتدائی خیال ایک قدرتی سلسلے میں دیکھ[illegible] - سوسائٹی کے متعلق ان تمام متفرق - کثیر التعداد اور ہم شکل مگر بظاہر مختلف افعال کا سلسلہ وار ذکر کرنا - اور یہ جتلانا کہ بعض رسومات یا عقاید مذہبی ان [illegible] ابتدائی افعال سے کس طرح پیدا ہُوئے - مضمون ہذا کا مدعا ہے :-

ڈالی

(۱)

آجکل اگرچہ مساوی حیثیت کے اشخاص میں ڈالی کا رواج پایا جاتا ہے ۔ لیکن یہ حالت شروع کی نہیں ۔ آخری حالت ہے ۔ آغاز اِس کا اس طریق سے ہوتا ہے کہ محکوم ۔ حاکم کو ۔ یا مغلوب ۔ غالب کو ۔ یا ادنیٰ ۔ اعلیٰ کو کوئی تحفہ بطور رضاجوئی کے دیتا ہے ۔ بعد میں دُوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ اعلیٰ ۔ ادنیٰ کو یا حاکم ۔ محکوم کو تحفہ یا ڈالی کے مقابلے میں بطور نشانِ خوشنودی کچھ چیز واپس کرتا ہے ۔ جب ڈالی اور عطیے کی رسم مستحکم ہو جاتی ہے ۔ اور اپنے سے کچھ چیز علیحدہ کر کے دُوسرے کو دینے میں ۔ حصولِ خوشنودی یا رضاجوئی مفہوم ہونے لگتا ہے ۔ تو مساوی حیثیت اشخاص میں ڈالی کا رواج موجود ہو جاتا ہے ۔ یہ صریحًا درست ہے کہ سوسائٹی کے آغاز میں جب کہ کل اشخاص مساوی حیثیت کے تھے ۔ اور کسی ایک شخص کی حکومت دُوسروں پر نہ تھی ۔ سلام ۔ خوشامد کی طرح ۔ ڈالی کا رواج بھی معدوم تھا ۔

اِس فعل کا آغاز بطور فعلِ اطاعت کے ہُوا ۔ اور اس کا بیج اسوقت بویا گیا جب ایک شخص نے چند دیگر اشخاص کو بوجہ طاقتِ بدنی ۔ یا طاقتِ دماغ و فکر قابو میں لاکر ان کو اپنے ماتحت کیا ۔ اور مفتوح کی جان ۔ اسکا مال ۔ اس کی اولاد ۔ غرض ہر ایک چیز فاتح کی ملکیت سمجھی جانے لگی ۔

غالب کا مغلوب سے خارجی علامت اطاعت کا طلب کرنا ۔ سب سے مقدم خیال ہوتا ہے ۔ جو شخص مقابلہ چھوڑ کر اطاعت قبول نہ کرے ۔ وُہ دشمن ہوتا ہے جس کے زیر کرنے بلکہ بعض اوقات نیست و نابود کرنے سے ہی شخص غالب کی طاقت باقی مغلوبین پر قائم رہ سکتی ہے ۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کرے یا تو اس کی طاقت کو توڑ کر اس کو مطیع بنا لیا جاوے ۔ یا اگر اس کی طاقت زیادہ ہو ۔ تو مفتوح ہونے پر وُہ تمام افراد جو شخص مغلوب کے مطیع ہوں شخص غالب کے دائرہ اطاعت میں لائے جاویں ۔ اسی طرح لڑائی ۔ جھگڑے ۔ کُشت و خون کے بعد جب ایک شخص اپنی طاقت بمقابلہ دوسروں کے فائق ظاہر کرتا ہے ۔ تو کمزوروں کے لئے مقابلہ و مخالفت کا ترک کرنا مصلحت

ہوتا ہے - اور فاتح مفتوح سے علامتِ اطاعت طلب کرتا ہے - سب سے اوّل فعل اطاعت ہتھیار رکھ دینا ہوتا ہے - یعنی بیرونی علامتِ مخالفت و مقابلہ ترک کر کے اور مطابعت قبول کر کے مفتوح کے رحم پر یا اُس کے قابو میں اپنے آپ کو ڈال دینا - اِس کے بعد جب مسلسل تابعداری مطلوب ہوتی ہے - تو غالب مغلوب سے قدرتاً یہ طلب کرتا ہے کہ آیندہ کے لئے بھی فرمانبرداری و وفاداری کی حلف اُٹھالی جاوے - یعنی اطاعت غیر مشروط کے بعد قسمِ رفاقت لی جاتی ہے - لیکن اس کے سوا غالب مغلوب سے کچھ طلب نہیں کرتا - البتہ چونکہ آغازِ تمدّن میں مفتوح کی جان و مال فاتح کے کلّی اختیار میں ہوتی تھی - اور کوئی شخص کسی چیز کو شخص غالب کی صریح یا معنوی اجازت کے بغیر استعمال نہ کرسکتا تھا - اور نیز چونکہ حاکم کی ناراضگی پر کل جائداد چھین لی جاسکتی تھی - اور ہر طرح کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا تھا - اِس لئے مصلحتِ زمانہ کے مطابق محکوم کی جانب سے حاکم کو خوش رکھنے کی پہلی ترکیب - اپنی مقبوضہ اشیاء میں سے بعض اشیاء کا خودبخود دیدینا شروع ہوا - تحفہ تحائف کی بُنیاد قائم ہوئی - اور ڈالی کا بیج ڈالا گیا - ہر ایک شخص اپنی ذاتی منفعت کو مدّنظر رکھ کر - اس خیال سے کہ اگر شخص غالب دندانِ طمع دراز کرے - یا خوش نہ رہے - تو کُل اشیا مقبوضہ ضبط کرلیگا - خودبخود اپنی ملکیّت میں سے کچھ حصّہ بطورِ تحفہ دینے لگ گیا - تحفہ تحائف کا دینا شروع میں فرض نہ تھا - بلکہ ایک مصلحت تھی - جس کا اصول یہ تھا کہ ملکی حاکم کو جس کے اختیار میں کُل کا چھین لینا ہے - اِس کو پیشتر ہی سے جزو جائداد دیکر اس اظہارِ اطاعت سے خوش کیا جاوے اور دوم اس کے ذاتی لالچ کو خودبخود پورا کر کے آیندہ کے زیادہ نقصان سے محفوظ ہو جاویں -

اگرچہ شروع میں یہ رسم غیر لازمی تھی لیکن تمدّن کے ترقی کرنے پر اس کی شکل و ماہیت میں تبدیلی واقع ہوئی - ایک پہلو سے تو یہ دیکھا گیا کہ ملکی حاکم کا اختیار غیر محدود سے محدود ہو گیا - اور کُل جائداد کے خواہ مخواہ چھین لینے کا اختیار جاتا رہا - جو مال و متاع کہ مغلوبین کے پاس صرف انکا مقبوضہ ہوتا - وہ اب انکا مملوکہ خیال کیا گیا - ان کی ذات و جائداد محفوظ قرار دی گئی - تاوقتیکہ قانون کی خلاف ورزی پر - بطورِ سزا یا پاداشِ جُرم قید - جرمانہ - یا ضبطی جائداد کا حکم صادر نہ ہو - لیکن دوسرے

پہلو سے بادشاہ یا ملکی حاکم کو جو تحفہ تحائف غیر لازمی طور پر دیئے جانے شروع ہوئے تھے - وُہ لازمی ہوکر بادشاہ کا حق قرار دئے گئے - بجائے گاہ بیگاہ دیئے جانے کے معیّن اوقات میں لئے جانے شروع ہوئے - اور بجائے کُل جائداد کے صرف جُزو جائداد پر حقِ شاہی قائم ہُوا - یعنی آغازِ تمدن میں جس وقت بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا - اور قانون اس کی زبان ہوتی تھی - کل جائداد کے آئندہ ضبط ہوسکنے کے احتمال سے مصلحتاً پیشتر سے ہی گاہ بیگاہ خود بخود ملکیت کا کچھ حصّہ بطور تحفہ و اظہارِ اطاعت پیش کیا جانا شروع ہُوا - لیکن تمدن کے ترقی کرنے پر جب ذات و جائداد محفوظ ہوگئی (علاوہ اس کے کہ جُرم خلافِ قانون مقررہ سرزد ہو) اس کے ساتھ ہی جُزو جائداد کا بادشاہِ وقت کی خدمت میں بطور نذرانے کے اوقات معین پر پیش کرنا لازمی ہوگیا - گویا ڈالی ٹکس اور مالگذاری کی شکل میں نظر آنے لگی - شروع میں جب نقدی کا رواج نہ تھا - تو ہر ایک چیز کا حصّہ جنسی لیا جانا جاری تھا - بعد میں ٹکس نقدی کی صُورت میں منتقل ہوگیا - جب بجائے سابقہ غیر معین اشخاص سے غیر معین اوقات پر تحفہ تحائف لینے کے - معین طریق پر مُستقل آمنی شاہی قائم ہوگئی تو ڈالی کی شکل میں ایک اور تبدیلی واقع ہونے کی صریح وجہ موجُود ہوگئی - ایک طرف سے تو علاوہ مقررہ ٹکس کے کوئی فرض نہ تھا کہ شخص مطیع کوئی نذر نذرانہ خود بخود دیوے - لیکن دوسری طرف سے اس فعل کا وُہ اثر کہ جس کے باعث یہ رسم شروع ہُوئی جاتا رہا - جب قانون ہوگیا کہ ہر شخص جو پانچسو (صما) سے زیادہ آمدنی رکھتا ہے اپنی آمدنی میں سے فی روپیہ ۵ پائی داخلِ خزانہ سرکار کرے - یا جب یہ بات فیصلہ پاگئی کہ پیداوارِ اراضی اُٹھانے کے بعد سرکار کو فی کنال ۸ر معاملہ ادا کیا جاوے تو انکم ٹکس یا مالگذاری یا یُوں کہو کہ فرائضِ قانونی ادا کرنے سے خاص طور پر بادشاہ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کا موقع جاتا رہا - یعنی وُہ اثر اور وُہ مطلب جو شروع میں رسمِ تحفہ کا محرک تھا موجودہ صُورت میں حصُولِ خوشنودی کا محرک نہ رہا -

جب یہ حالت ہُوئی تو جن اشخاص کو خاص ذاتی اغراض کی وجہ سے خصوصیت سے اظہارِ اطاعت اور حصُولِ خوشنودیِ مزاجِ حاکمِ مُلکی مطلوب تھا وُہ اس پر اکتفا نہ کرسکتے تھے کہ معمولی

طریق پر مثل دیگر اشخاص صرف ٹکس - یا مالگذاری ہی دیدیویں - اُنہوں نے خصوصیت ظاہر کرنے کی وجہ سے اور انسانی طبیعت سے فائدہ اُٹھانے کی نیّت سے بروقتِ مُلاقات - حاکم ملکی کے پاس کوئی خاص تحفہ علاوہ معمولی ٹکس یا مالگذاری کے خودبخود لیجانا شروع کیا - اسی طرح سے ہرایک شخص نے جس کو غرض حصُولِ خوشنودی بادشاہ تھی - تحفہ تحائف بروقتِ مُلاقات لیجاکر رواجِ نذر نذرانہ کی بُنیاد قائم کردی - یہ رسم بھی اگرچہ قانونی فرض نہ بنی بوجہ اس کے کہ قانونی حق بادشاہ کا پہلے قائم ہو چکا تھا - لیکن مستحکم ہوکر مستقل رواج کے پائے تک پہنچ گئی - اور یہ رواجاً لازمی ہوگیا کہ ہرایک شخص خواہ امیر ہو خواہ غریب - خواہ غرض رکھتا ہو خواہ محض مُلاقات کے لئے جائے - جب حاکمِ وقت کی خدمت میں حاضر ہو تو بروقتِ حصُول نیاز کچھ نہ کچھ نذر نذرانہ ضرور پیش کرے -

اس درجے پر پہنچ کر - رواج واپسی نذرانہ کا قائم ہوجاتا ہے - شروع میں نذرانہ صرف اُن اشخاص کا واپس کیا جاتا تھا جو غریب ہوتے تھے - یا جن کو کوئی ذاتی منفعت مطلوب نہ ہوتی تھی - یا جن اشخاص میں یہ توقع پیدا کرنی مناسب نہ ہوتی تھی کہ اسکا معاوضہ بادشاہ کی طرف سے اُن کو کسی آئیندہ وقت میں ملیگا - بعد ازاں بلاتمیز ہرایک حالت میں نذرانہ واپس ہونا شروع ہوتا ہے - لیکن نذرانے کے پیش کرنے کی رسم - بطور بیرونی علامت مطابعت و وفاداری کے قائم رہتی ہے - نذر نذرانہ پیش کرنا رواجی فرض ہوجاتا ہے - اگرچہ ساتھ ہی جیسا کہ ٹکس اور مالگذاری کے بارے میں ذکر کیا گیا - پھر اصل مطلب و منشاء جس کی وجہ سے آغاز اس رسم کا ہوا وہ معدوم ہوجاتا ہے - دیسی ریاستوں میں مثلاً مہاراجہ صاحب جمُوں و کشمیر کے دربار میں روپیے نذر کے طور پر پیش کیئے جاتے ہیں - مہاراجہ صاحب چھُوکر واپس کردیتے ہیں - اور اگرچہ روپیے دکھلانے یا پیش کرنے میں کوئی خاص حصُولِ خوشنودی مزاج نہیں ہوتا کیونکہ ہرایک شخص کے واسطے یہ ایک معمولی رسم ہے - لیکن اس رسم کا ادا نہ کرنا - باعث رنجیدگی خاطر ضرور ہوتا ہے -

انگریزی حکام اعلیٰ مثلاً چیف کمشنر - لفٹنٹ گورنر - اور وایسرائے کو بھی خاص دربار کے موقعوں پر سفید ریشمی رومالوں پر اشرفی وغیرہ رکھکر پیش کرنے کا رواج اب تک موجود ہے - گو یہ اب محض ایک اظہارِ اطاعت ہے - اور اس کا اصلی مطلب یعنی خاص طور پر ذاتی منفعت کی غرض سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا اب معدوم ہو گیا ہے -

جب ایک رسم محض اسی غرض سے قائم ہوئی کہ غیر معمولی طریق پر بروقتِ ملاقات تحفہ پیش کر کے خاص طور پر حاکمِ ملکی کی رضاجوئی کر کے مطلب براری ہو سکے - اور جب یہ رسم عام ہو جانے کی وجہ سے رواجی فرض میں تبدیل ہو گئی - بلکہ رواج واپسی نذرانہ بھی قائم ہو گیا - تو ایک اَور ترکیب اسی سلسلے میں دیکھی جاتی ہے - خاص عنایاتِ شاہی کے جو مطلوب ہوں - اُن کا خاص طور پر معاوضہ علاوہ معمولی ٹیکس - اور علاوہ رواجی نذر کے جاری ہو جاتا ہے - یعنی خاص ضرورت اور غیر معمولی ضرورت امداد شاہی کے وقت خاص ہی سے کام چلایا جاتا ہے - مہاراجہ صاحب گلاب سنگھ سابق والی جموں و کشمیر کا قاعدہ تھا کہ ایک روپیہ خاص طور پر دیئے جانے پر رعایا کے عرائض سُنا کرتے تھے -

انگلستان میں بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہُوا - امداد شاہی خاص نذرانہ سے حاصل ہو سکتی تھی - بعد میں یہ استحقاق رعایا کا قائم کیا گیا کہ رسُوم مقررّہ کے ادا کرنے پر امداد شاہی حاصل کر سکیں -

جس طرح سے تحفہ تحائف غیر لازمی سے لازمی ہو جانے پر ٹیکس کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور بعد ازاں ضرورت نے نئی رسم نذرانہ پیدا کی اور جس طرح کہ بعد میں یہ رسم بھی پایہ مستقل رواج کے پائے پر پہنچکر - دوبارہ ضرورت خاص فیس کی ہُوئی - اسی طرح سے خاص فیس کے دیئے جانے کی رسم مستحکم ہو کر لازمی بن گئی - اور قانون ہو گیا کہ سوائے رسُوم مقررّہ کے کوئی امداد شاہی نہ دیجاویگی - اب اگر استغاثہ کرنا ہو تو کورٹ فیس - عرضی دائر کرنی ہو تو رسُومِ عدالت لازمی ہیں - سلسلہ ارتقا میں ڈالی اسوقت کورٹ فیس کے لباس میں دیکھی جاتی ہے -

(باقی آئندہ)

قرۃ العین

ناظرین - آپ نے میرزا علی محمد باب کا نام اکثر سنا ہوگا جس نے ایران میں پیغمبری کا دعویٰ کیا اور ۱۸۴۴ء میں بابی مذہب کی بنیاد ڈالی - اس شخص نے باب کا لقب اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو باب اللہ سمجھتا تھا - یعنی دروازہ جس سے آدمی خدا کے ایوانِ معرفت میں داخل ہو سکتا ہے رفتہ رفتہ اس مذہب کو ایسی ترقی ہوئی کہ ایک انبوہِ کثیر میرزا محمد علی کا پیرو ہو گیا جس میں بڑے بڑے عالم اور ذی عزت لوگ شامل تھے - ہر طرف اس نئے فرقے کا ایک تہلکہ مچ گیا تھا یہاں تک کہ سلطنتِ ایران کو اس کے ساتھ مقابلہ و مجادلہ کرنا پڑا - اس مذہب کی بہت بڑی حامی ایک عورت قرۃ العین نامی گذری ہے جو بابیوں میں مثل خواتینِ اہل بیتِ رسالت بہت ہی احترام کے قابل مانی جاتی ہے - اور اسی کے حالات اس وقت لکھے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں

قرۃ العین کا اصلی نام "زرین تاج" تھا جو اس کے سر پر سنہری بال ہونے کی وجہ سے رکھا گیا تھا - اور علمائے قزوین کے ایک مشہور خاندان سے تھی - چنانچہ اس کا باپ حاجی محمد صالح ایک مشہور فقیہہ تھا اور اس کا چچا ملا محمد تقی قزوین کا ایک معزز عالم تھا - علاوہ ان کے اس خاندان کے اور چند ممبر بھی اعلیٰ درجے کے عالم مانے جاتے تھے - بچپن سے اس لڑکی کو تحصیل علم کا بہت شوق تھا اور اسی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر کربلا تک گئی اور وہاں کے مشہور فضلا سے تعلیم پائی غرضکہ اپنی کوشش سے وہ علم و فضل کا مجسم نمونہ ہو گئی تھی - بارگاہ ایزدی سے اسے حسن بھی خوب عطا ہوا تھا اور ساتھ ہی نہایت باحیا اور باعصمت تھی - باب کا شہرہ سنکر اول اول قرۃ العین نے اس سے خط کتابت شروع کی اور پھر ملاقات کے بعد اس کی ایسی معتقد ہوئی کہ بابی مذہب کو سب سے اچھا اور سچا مذہب سمجھتی تھی - آخرش یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس نے علانیہ بابی مذہب کی ترقی و اشاعت میں کوشش شروع کر دی - جہاں وہ جاتی اور جس مجمع میں اس کا گذر ہوتا وہاں وہ نہایت

آزادی کے ساتھ باب کے فضائل بیان کرتی - بابی مذہب کی سچائی کا یقین دلاتی اور اس کے لئے بڑے شد و مد کے ساتھ عقلی و نقلی دلائل پیش کرتی - اسی غرض کے لئے اُس نے کربلائے معلّٰے کا سفر اختیار کیا - یہاں کے اہل علم اُس کے عالمانہ اوصاف سے پہلے سے واقف تھے اور اب اسکا پُر اثر وعظ سُننے کے لئے ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہونے لگا اور شہر کے بہت سے آدمی اسکی جادو بیانی کی بدولت بابی ہو گئے - جب یہ حالت ہوئی تو علما کی شکائت پر گورنر نے اُس کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن اس کو پہلے خبر ہو گئی تھی اس لئے وہ یہاں سے بغداد کو چلدی - بغداد میں بھی اُس نے وہی طریقہ اختیار کیا اور گورنمنٹ عثمانیہ کے حکم کے موافق یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور ہوئی - تاہم اُس نے بغداد سے کرمان شاہ اور ہمدان تک پہنچتے پہنچتے چند مشہور علما و عمائدِ دین کو بابی کر لیا - ہمدان سے اپنے وطن قزوین میں آکر اُس نے ایک ایسا قصد ظاہر کیا جس سے سُننے والوں کو اُس کے جوش پر تعجب ہوتا تھا - وہ یہ تھا کہ محمد شاہ بادشاہ ایران کو بابی بنایا جاوے - یہ ارادہ کر کے وہ طہران کی طرف روانہ ہوئی مگر وقت پر اس کے باپ کو معلوم ہو گیا - چنانچہ اُس نے ڈر کے مارے چند عزیز بھیجکر قرۃ العین کو واپس قزوین بُلا لیا -

قرۃ العین کی شادی اُس کے چچا کے بیٹے ملا محمد سے ہوئی تھی جو بابی مذہب کا دشمن تھا - اس وجہ سے ہر وقت آپس میں ناراضمندی رہتی تھی - آخر ش ملا محمد نے قرۃ العین کو طلاق دینے کے سوائے کوئی چارہ نہیں دیکھا اور اب قرۃ العین کو باب کی تائید کے لئے کامل آزادی مل گئی جس کی وہ نہائت خواہشمند تھی - مگر قزوین میں اس کے مخالفوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی - جو ہر وقت اس کی جان کے درپے رہتے تھے - اس لئے وہ قزوین سے نکل کر طہران اور طہران کے بعد خراسان گئی - خراسان سے رشت پہنچی جہاں بابیوں کی ایک جماعت موجود تھی - رشت سے وہ اشاعتِ مذہب کے لئے مازندران گئی اور یہاں ایک بہت بڑی مجلس میں نہایت عمدہ تقریر کی - اثنائے تقریر میں اُس کا نقاب چہرے سے ہٹ گیا تو تمام حضار مجلس اُس کی نُورانی صُورت اور خداداد حُسن دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے - مگر یہاں بھی

وُہ جبین سے نہ رہ سکی اور بیچاری کو جنگل جنگل پھرنا پڑا۔ اس عرصے میں مازنداں کے بابیوں اور بادشاہی فوج سے تکرار ہوگئی اور ایک بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا جس میں ایک ہزار بابی قتل کیئے گئے۔ اب قرۃ العین نور پہنچی اور یہاں کے حاکم نے اسکو حراست میں طہران روانہ کیا۔ اب محمد شاہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا تھا اور شاہ ناصر الدین قاچار تخت پر تھے۔ جب ہز مجسٹی کے سامنے قرۃ العین پابزنجیر لائی گئی۔ تو شاہ کو اس کے حُسن و جادو بیانی اور علم و فضل کا بہت خیال ہُوا اور آپ نے حکم دیا کہ ایسی عورت کا مرنا بہت افسوسناک ہوگا۔ اِس لئے اُسکو چھوڑ دیا جائے۔ مگر وُہ کوتوالِ شہر کی نگرانی میں رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ مگر وُہ یہاں بھی برابر اشاعتِ مذہب میں کوشش کرتی رہی۔ زنانہ مجلسوں میں جاکر تقریریں کیں اور طہران کے بعض معزز خاندانوں کو بابی بنالیا۔

المختصر قرۃ العین اپنی ساری قوت اس مذہب کے پھیلانے میں صرف کرتی تھی اور اسکی اور خود مرزا علی محمد باب کی کوشش سے اس مذہب کے ماننے والے روز بروز بڑھتے جاتے تھے اور عجب نہیں کہ ایک روز تمام سلطنت کا مذہب بابی ہوجاتا مگر ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے بابیوں کی حالت کو بہت ہی خراب کر دیا۔ یعنی ۱۵۔ اگست سنہ ۱۸۵۲ء کو شاہ ناصر الدین کوہ البرز کے دامن میں گھوڑے پر ہوا خوری کو نکلے۔ ایک مقام پر تین شخص شاہ کے سامنے آئے جنکی نسبت اُنھوں نے خیال کیا کہ کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ جب وُہ پاس پہنچے تو ایک شخص نے پستول نکالکر بادشاہ کی طرف فائر کیا مگر نشانہ خطا ہُوا۔ پھر ایک دُوسرے شخص نے بادشاہ کو گھوڑے سے گھسیٹ کر زمین پر گرادیا اور سر کاٹنا چاہتا ہی تھا کہ ایک شاہی فراش نے نہایت چُستی سے خود اُسی کا سر اُڑا دیا۔ یہ دیکھ کر اُس کے اور دو ساتھی فرار ہو گئے اور بادشاہ کی جان بچ گئی مگر اُس روز سے بابی سلطنت کے بدخواہ خیال کیئے گئے اور بابی ہونا ایک سخت جرم ہوگیا۔ تمام سلطنت میں تفتیش کی گئی اور ہزاروں بابی گرفتار ہوئے اور نہایت بیرحمی سے قتل کیئے گئے۔ بہت سے آدمیوں نے ہر طرح کی تکلیف و اذیت اُٹھائی مگر بابی مذہب سے منحرف نہیں ہُوئے۔ اِس کے بعد بھی بارہا کثیر التعداد بابیوں کو قتل کیا گیا۔ مگر یہ گروہ اب تک موجود ہے۔

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ میرزا علی محمد اس واقعہ سے چند روز پہلے قتل کیا گیا تھا اور بعض کا خیال ہے کہ وُہ بھی ان لوگوں میں تھا جو اس حملے کے بعد گرفتار ہُوئے اور نہ صرف وُہ بلکہ قرۃ العین اور بہت سے نامور بابی لیڈر بھی۔ اَور سب قیدی تو بہت سی تکلیفوں کے بعد قتل کر دیئے گئے مگر قرۃ العین شاہ کے سامنے پیش کی گئی۔ اس موقعہ پر اکثر وزرا و افسرانِ فوج موجود تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کسی طرح اس عورت کی جان بچ جائے۔ اس لئے اُس سے ایسے سوال کئے گئے کہ وُہ باب کی تائید اور اس کے مذہب کی طرفداری سے انکار کرے اور یہ بھی کہدیا گیا کہ اگر انکار نہ ہوگا تو قتل لازمی ہے۔ مگر اُس نے باب ہی کا کلمہ پڑھا اور اُس کو پیغمبر یا امام برحق سمجھا بلکہ صاف یہ کہدیا کہ "میری مَوت تم کو میری صداقت کا یقین دلائیگی"۔ آخرش قتل کا حکم دیا گیا اور اسکو پھانسی دیکر نعش ایک اندھے کنوئیں میں ڈالدی۔ مگر بعض انگریز سیاحوں کا بیان ہے کہ وُہ جلائی گئی۔ اس طرح اس علم و فضل کی تصویر کا خاتمہ ہوُا جس نے بڑے بڑے عُلما و مجتہدین سے عرصے تک بحثیں کیں۔ اُن کے اعتراضات کے دندان شکن جواب دیئے اور اپنے دعویٰ کو قرآن۔ حدیث اور مذہبی دلائل سے ثابت کیا۔ جس نے ہزاروں آدمیوں کے مجمعوں میں پُرزور تقریریں کیں اور ہزاروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

قرۃ العین نے نظم و نثر دونوں میں بہت لکھا اور چند کتابیں بھی تصنیف کیں مگر یہ تمام سرمایہ تلف ہوگیا۔ وُہ طاہرہ تخلص کرتی تھی اور یہی وُہ لقب تھا جو باب نے عصمت و پاکدامنی کی وجہ سے اُسکو عطا کیا تھا۔ اب اُس کی مفصلہ ذیل دو غزلیں مصنّفوں کو بہت تلاش سے دستیاب ہوئی ہیں۔

(۱)

جذباتُ شوقِکَ الجمت بسلاسلِ غم والبلا ہمہ عاشقانِ شکستہ دِل کہ دہند جاں برہ بلا

اگر آں صنم زسرِ ستم پئے کُشتنِ منِ بے گنہ لَقدِ استقام بسیفہٖ فلقد رضیتُ بما رضا

سحر آں نگارِ ستمگرم قدمے نہادہ بہ بسترم وَاِذا رأیتُ جمالَہٗ طلعَ الصّباحُ کانّما

نہ چو زلفِ غالیہ بارِ او نہ چو چشمِ فتنہ شعارِ او شدہ نافہ بہمہ ختن شدہ کافرے بہمہ خطا

تو کہ غافل از مے و شاہدی پے مرد عابد زاہدی
چہ کنم کہ کافر جاہدی ز خلوص نیت اصفیا

بمراد زلف معلّقے پے اسپ و زین مغرقے
ہمہ عمر منکر مطلقے ز فقیر فارغ بے نوا

تو و مُلک و جاہ سکندری من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں خوش ست تو در خوری وگر ایں بدست مرا سزا

بگذر ز منزلِ ما و من بگزیں بملکِ فنا وطن
فَاِذَا فعلتَ بمثل ذا فلقدْ بلغتَ بما تشَا

(۲)

لمعات وَجهك اشرقتْ وشُعاع طلعتك اعتلا
زچہ رو اَلَستُ بِرَبِّکُمْ نزنی بزن کہ بلیٰ بلیٰ

بجواب طبل الست تو ز ولا چہ کوس بلےٰ زدند
ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہِ غم و حشم بلا

من و عشقِ آں مہ خوبرو کہ چو زد صدائے بلا برو
بنشاط و قہقہہ شود فرو کہ انا الشہید بکربلا

چو شنید نالۂ مرگ من پے ساز من شد و مرگ من
فمشٰی اِلَیَّ مُهَرْوِلًا وبکیٰ عَلَیَّ مجلجلا

چہ شدہ کہ آتش حیرتے زنیم بقلۂ طورِ دل
فلکتہٗ و دککتہٗ متدککًا متزلزلا

پے خوان دعوت عشق او ہمہ شب ز خیل کروبیاں
رسد ایں صفیر مہیمنے کہ گروہ غمزدہ الصلا

تو چہ فلس ماہیِ حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بنشیں چو طاہرہ دمبدم بشنو خروشِ نہنگِ لا

اِس قدر حالات معلوم کرنے کے بعد ناظرین کو وہ اصُول دریافت کرنے کا انتظار ہوگا جنپر بابی مذہب قائم ہُوا اور خود باب اور قرۃ العین جنکی تعلیم دیتے تھے۔ لہٰذا وہ مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں :-

(۱) مخلوق خالق کو نہیں پہچان سکتی اس لئے مشیتِ اولی نے انسان کی صُورت میں حلول کیا۔

(۲) خُدا نے جن صورتوں میں حلول کیا انکو پیغمبر کہتے ہیں۔

(۳) پیغمبر بے شمار ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی اسی طرح ہوتے رہینگے۔

(۴) مشیت اولی اب باب کے ذریعے سے بولتی ہے۔

(۵) اگر قرآن حضرت محمد صلعم کی رسالت کی دلیل ہے تو "بیان" باب کی صداقت کے لئے کافی ہے۔

(۹) قرآن کے لفظوں میں لاثانی فصاحت و بلاغت نہیں ہے بلکہ جو اثر اُن میں پیدا کیا گیا وُہ لاثانی ہے۔

(۱۰) حضرت باب اللہ ہی مہدی موعود ہیں۔

یہ وُہ اصول ہیں جن کی تعلیم و تلقین میں قرۃ العین نے تمام عمر صرف کر دی اور جن کے پھیلانے میں وُہ خود اپنے آپ کو اور تمام دُنیا کو بھولی ہوئی تھی۔ اُسکو کسی ذاتی یا دنیاوی معاملے سے کچھ سروکار نہ تھا اور صرف ایک مقصد تھا کہ لوگوں کو بابی مذہب کی سچائی کا یقین دلایا جاوے اور جنکو یقین ہو جاتا تھا وہ بابی ہو جاتے تھے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے میں اُسکو کسی بات کا حتیٰ کہ اپنی جان تک کا بھی خوف نہ تھا۔ اور اگر ہوتا تو وُہ بابی مذہب سے انکار کر کے اپنی جان بچا سکتی تھی۔ مگر اُس کے دل نے کسی طرح گوارا نہیں کیا کہ وُہ مرنے کے خوف سے ایک سچی بات سے انکار کرے ۔

نیاز احمد (از میرٹھ)

اَے مہِ عید بے حجاب ہے تو
حُسنِ خورشید کا جواب ہے تو

اَے گریبانِ جامۂ شبِ عید
شاہدِ عیش کا شباب ہے تو

اے نشانِ رکوعِ سورۂ نُور
نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو

اَے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز
طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو

ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس
قابلِ ذٰلک الکتاب ہے تو

چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا
کہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تو

طوفِ منظرگہِ زمیں کے لئے
ہمہ تن پائے دررکاب ہے تو

یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھپنا
روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شورِ طفلی ہے

(سید نذیر حسین بی اے)
(از سنبھل)

کرشن جی

وُہ سبزہ زار جو دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہیں - باوجُود سبز قدم فتحمندوں کے پیروں کے نیچے پے در پے روندے جانے کے بھی - اب تک اپنی رعنائی اور دلفریبی سے ہر ایک سیّاح کے دل کو مسخر کر لیتے ہیں - کوسوں تک زمین نے سبز لباس پہن لیا ہے - اور مولسری اور تمال کے خوشنما درخت عجب آن بان سے قطار در قطار کھڑے ہیں - اور اُن کے سائے نے اس سرزمین پر سحر کا سا اثر ڈال رکھا ہے - پانی کی بھی یہاں کمی نہیں - جگہ جگہ صاف شفاف پانی کے نیلگوں چشمے ہیں جنکے گرد ہر وقت چرند و پرند کا رمنا رہتا ہے - علاوہ قدرت کی گوناگون خوبصُورتی کے اس منظر کی دلچسپی کو ایک اَور خیال نے بھی بڑھا رکھا ہے - یہی مقام ہے جسے ہندو مذہب کا گہوارہ کہنا چاہئے - اور یہیں سے علم و فضل کی وُہ ندی بھی نکلی جس سے اہلِ یونان اور دیگر اقوامِ قدیمہ سیراب ہوئیں - اِسی جگہ وُہ شہر (متھرا) واقع ہے - جو لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے مودبانہ توجہ کا مرکز اور مقدس خیالات کا مرجع ہے -

یہیں وُہ شخص پیدا ہُوا جس نے انہیں نیکی اور محبت کے راستے پر چلنے کی تلقین کی اور یہی زمین تھی جس نے اس کے ان قدموں کو چھُوا جنکی برکت سے وُہ نجات اور مغفرت کی اُمّید رکھتے ہیں -

تاریخ سے ثابت ہے کہ متھرا کسی زمانے میں ایک نہایت عظیم الشان شہر تھا - یہاں کی عمارات مندر وغیرہ ہندوستان میں آپ ہی اپنی نظیر تھے - اور کیوں نہ ہوتا ایک دولتمند اور صاحبِ جاہ راجے کا پایۂ تخت تھا - مگر اب اس کی وُہ اگلی سی خوبصُورتی زمانے کی دستبرُد سے محفوظ نہیں رہی - گو اب بھی ہندو مذہب کا جس قدر چرچا یہاں ہے وُہ شاید ہی کسی اَور جگہ ہو - ہر روز صبح کو بے شمار مندروں میں ناقوس اور گھنٹوں کی آواز سُنائی دیتی ہے - اور سینکڑوں زن و مرد جمنا میں اشنان

کر کے پُوجا پاٹ کے لئے جاتے ہیں۔ اِن سب مندروں میں زیادہ مشہور کیشب دیو کا مندر ہے جسے تعمیر ہوئے غالباً کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا۔ اِس مندر کے قریب ایک کوٹھری ہے۔ جو اس مقام کا پتہ دیتی ہے۔ جہاں آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے دو حرمان نصیب میاں بی بی۔ جادون خاندان کے ایک ظالم راجے اور بے مہر رشتے دار کے حکم سے مقید تھے۔ ناز و نعمت میں پلے ہوئے شاہی خاندان کے نونہالوں کے لئے قید خانہ جہنّم سے بدتر تھا۔ اور زندگی بالکل تلخ ہوگئی تھی۔ جینے کا کچھ مزا نہ رہا تھا۔ بلکہ زیست موت سے بدتر تھی۔ طرح طرح کے ظلم و تعدّی اور خصوصًا اولاد کی موت کے داغ سہتے سہتے کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا۔ مگر ایک پیشین گوئی کے پورا ہونے کی اُمید انہیں کچھ سہارا دیئے ہوئے تھی۔ اور انکی زندگی کے گراں بوجھ کو ایک کمزور دھاگے سے لٹکائے ہوئے تھی۔ انکو ایک موہوم سا خیال تھا کہ کبھی نہ کبھی ہمارے بھی بُرے دِن پھر ینگے اور کوئی نہ کوئی بے رحم راجہ کنس سے ہمارا بھی بدلہ لینے والا پیدا ہوگا۔

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خُون کیونکر
جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہُو پکارے گا آستیں کا

یہ دل خوش کن خیال اس تنگ و تاریک محبس کے اندھیرے میں اور اس سے بڑھ کر انکی اپنی سیاہ بختی کی اندرونی ظلمت میں ایک روشنی کی شعاع ڈالدیتا تھا۔ اور اپنے انعکاس سے انکی زندگی کے ٹمٹماتے ہُوئے چراغ کی لو کو بھی اکسا دیتا تھا۔

بی بی کو جسکا نام دیوکی تھا صبح و شام بچہ پیدا ہونے کی اُمّید تھی۔ مگر یہ خیال بجائے انکو خوش کرنے کے اور بھی افسردہ خاطر بنائے دیتا تھا۔ پہلے سات بچّے اُن کے ہاں پیدا ہوچکے تھے۔ مگر انہیں کسی کو بھی آغوش میں لینا نصیب ہُوا تھا۔ ساتوں کے ساتوں راجہ کنس کے حکم سے پیدا ہوتے ہی مروا دیئے گئے۔ اور ان کے پاس سوائے حسرت و ارمان کے۔ اور کچھ باقی نہ رہا۔ آٹھویں بچّے کی پیدائش کا انہیں خصوصًا فکر تھا۔ کیونکہ یہی بچّہ تھا جسکی نسبت نجومیوں نے راجہ کنس کو خبر دی تھی کہ تیرے تخت و تاج کو تاراج کریگا۔ اور جس کا وبال پہلے ساتوں

کی بھی معصوم جان پر پڑا تھا۔ گو دیوکی کے شوہر واسدیو نے اسے خفیہ طور پر قید خانے سے غائب کر دینے کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی دل میں طرح طرح کے خدشات اور وسواس پیدا ہوتے تھے۔ اور ایک عجیب اُمید و بیم کی کیفیت تھی۔

بھادوں کی آٹھویں تاریخ تھی۔ شب نے اپنی زلف کو پریشان کر رکھا تھا۔ اور سیاہ سیاہ بادلوں نے اُس کی ظلمت کو اور بھی زیادہ تاریک کر دیا تھا۔ آسمان کی ڈراؤنی صورت کسی اہم واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ مینہہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ گویا دیوکی اور واسدیو کی خستہ حالت پر زار و قطار آنسو بہا رہا تھا۔ اور چڑھے ہُوئے دریا کی موجیں مُنہہ کھول کھول کر تمام شہر کو نگل لینے کی دھمکی دے رہی تھیں۔ شاید وُہ اپنی موج خیز طغیانی سے ان انقلابات کی اطّلاع دیتی تھیں جو سرزمین ہند میں طوفان بپا کرنے والے تھے۔ بجلی قرطاسِ فلک پر آتشیں حرفوں کی تحریر میں ایک روشن بخت کی آمد سے لوگوں کو خبردار کر رہی تھی۔ اور آسمان کا خوفناک اَرگن رعد اپنی اُونچی سروں میں ایک عظیم الشان شخص کی خوش آمدید کا دل ہلا دینے والا راگ سُنا رہا تھا۔ پرندے گھونسلوں میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ اور آسمان کی یہ کیفیت دیکھ کر گردن بھی نہ اُٹھا سکتے تھے۔ تمام عناصر میں ایک ہل چل مچی ہُوئی تھی۔ اور آسمان و زمین دونوں میں ایک عجیب شورش مچ رہی تھی۔ واسدیو اور دیوکی کے دلوں کی گھبراہٹ موسم کی اس تیزی سے اَور بھی دوبالا ہوگئی تھی اور انکی اندرونی دُنیا کی شورش۔ اس بیرونی دُنیا کی شورش سے کسی طرح کم وحشت خیز نہ تھی۔ مینہہ اور تاریکی کا یہی عالم تھا کہ یکایک مشرق میں زور سے بجلی کوندی۔ جس سے ایک لحظہ کے لئے تمام منظر منوّر ہو گیا۔ لیکن دُوسرے لمحے میں، تاریکی پیشتر سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ہاں اسی بجلی کے کوندنے کے ساتھ ایک رُوح عالم بالا سے عناصر میں اُتر آئی۔ یعنے کرشن پیدا ہُوا۔

اگر یہ راجکمار کسی اَور وقت اور حالت میں پیدا ہوتا تو خبر نہیں کتنے خوشی کے شادیانے بجتے۔ اور کیا کیا جشن منعقد ہوتے۔ مگر اُس وقت تو اس کی جان کے لالے پڑے ہُوئے

تھے - اور یہی کوشش تھی کہ کسی کے کان میں اس کی بھنک تک بھی نہ پڑے - بدنصیب والدین نے اپنے لال کی پوری طرح شکل بھی نہ دیکھی اور واسدیو اُسے کپڑے میں لپیٹ کر قید خانے سے باہر پہنچا دینے کے ارادے سے چلا - محبس کے دروازے پر جگہ جگہ دربان بیٹھے تھے - جو آتے جاتے آدمی کا جائزہ لیتے تھے - مگر قسمت یا طوفان نے اسوقت انکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا - اور واسدیو اپنے قیمتی خزانے سمیت ان سب کی آنکھ بچا کر نکل گیا - اور شہر سے کچھ دُور جنگل میں جا نکلا - یہاں ان دنوں ایک خانہ بدوش فرقے کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے جو گوپوں کے نام سے موسوم تھے - اس فرقے کے سردار نند سے واسدیو نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا - چنانچہ حسب قرار داد کرشن جی نند اور اسکی بیوی جسودھا کے حوالے کئے گئے - اور نند نے کمال بہادری اور انسانی ہمدردی سے اپنی نوزائیدہ لڑکی - واسدیو کو دیدی - جنہوں نے اُسے لاکر دیوکی کے پہلو میں لٹا دیا - دُوسرے دن ظالم کنس کو خبر ملی کہ دیوکی کے ہاں کوئی لڑکا بالا پیدا ہوا ہے - وُہ سنگدل جلاد فوراً قید خانے پہنچا - اور آتے ہی اس ننھی سی جان کا قید خانے کے سنگین فرش کے ساتھ خاتمہ کر دیا -

یہاں پر لوگ ایک حکائت بیان کرتے ہیں کہ وُہ لڑکی فرش پر گرتے ہی آسمان کی طرف اُڑ گئی - جس سے راجہ کنس کو بہت کچھ خوف وہراس پیدا ہوا - لیکن یہ حکائت قابل تسلیم نہیں - ہاں یہ بات ضرور ہوگی - کہ راجہ کنس کے نفس توامہ نے اس خونی فعل پر اسے ملامت کی ہوگی - اور اس کی آئیندہ بربادی اور پاداش جرائم کا نقشہ اُس کے سامنے کھینچدیا ہوگا -

ادھر کی تو یہ کیفیت رہی - اُدھر کرشن جی جسودھا اور نند کے سایہ عاطفت میں پرورش پانے لگے - چونکہ گوپوں کی قوم ایک جگہ مقیم رہنے کی عادی نہ تھی - اِس لئے تھوڑے دن متھرا میں قیام کرکے نند نے گوکل کی طرف کوچ کر دیا - اور اسی مقام میں کرشن جی کا زمانہ طفولیت بسر ہوا -

وُہ حکائتیں جو انکی اوائل عمر کی نسبت ناعاقبت اندیش عقیدت کیشوں کی افترا پردازی کی بدولت مشہور ہیں - سب اسی زمانے اور اسی جگہ سے تعلق رکھتی ہیں - لیکن اگر ان حکایتوں کو ایک مورخ کی غائر نظر سے دیکھا جائے تو سوائے ایک نوعمر لڑکے کی طفلانہ شوخی کے اور کوئی بات ان کی تہ میں نہیں

معلوم ہوتی - خصوصًا جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس وقت کرشن جی کی عُمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی - تو ہمیں ان لوگوں کی کور باطنی پر نہ صرف افسوس ہوتا ہے - بلکہ انکی کم عقلی پر ہنسی بھی آتی ہے - جنہوں نے ایسی بے بُنیاد روائتیں بلا کسی ثبوت کے ایک نوعُمر لڑکے کی طرف منسوب کر دی ہیں - مگر اس میں شُبہہ نہیں کہ کرشن جی کو بچپن میں طفلانہ کھیلوں میں بہت انہماک رہتا تھا - اور اپنی شوخی اور چلبلے پن کی وجہ سے گوپوں کے تمام طائفہ میں ہر دلعزیز ہو گئے تھے - انکی رضاعی ماں جسودھا خصُوصًا ان سے محبّت کرتی تھی - اور یہ لقب کاہن یا کنھیا جس سے وُہ عوام میں مشہور ہیں اسی کا دیا ہوا معلوم ہوتا ہے -

گوپوں کے تمام لڑکے لڑکیاں کرشن جی کے حکم کی متابعت کرتی تھیں - اور اُنھوں نے اپنے ہمجولیوں کا خاصہ ایک لشکر بنا لیا تھا - جس کے سرگروہ خود بدولت تھے - کرشن جی کا گروہ گوکل کے میدانوں میں سارا دن رنگ رلیاں منایا کرتا تھا - اور انکے قہقہوں اور چہل سے جنگل میں منگل ہو جاتا تھا -

چاندنی رات میں خُوب لُطف رہتے تھے - کرشن جی کی بانسری سے تمام جنگل گونج اُٹھتا تھا - اور صحرائی جانور بھی محو ہو جاتے تھے - گوپوں کے لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ میں ہاتھ دیکر ایک حلقے میں ناچا کرتے تھے - اور اپنے ناچ رنگ سے جنگل کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیتے تھے - گوپیوںلہ کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا - مگر اس سادگی میں دلفریبی کا ایک عالم نکلتا تھا - انکی زیبائش زیادہ تر قدرتی پھُول تھے - جو پیشانی پر اور کانوں کے پیچھے باندھے جاتے تھے - اور جن کی چاندنی میں اس قدر بہار ہوتی تھی - کہ خود چاند بھی انکے معصوم چہروں کی آب و تاب دیکھنے کو - درختوں کی شاخوں میں سے جھانکا کرتا تھا - اور اپنی ہلکی ہلکی روشنی انپر رحمت کے سائے کی طرح ڈالدیتا تھا -

---

لہ گوپیوں یعنی گوپوں کی لڑکیوں کے لباس اور آرائش کی نسبت یہ کنایات ایک مصوّر ڈاکٹر گنگولی کی ایک تصویر سے اخذ کیے گئے ہیں - راقم

کرشن جی نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ برج کے میدان ان کے لئے مشاغل اور تفریحات کی ایک کان تھے۔ پتے پتے میں انہیں معرفتِ حق کا ایک دفتر نظر آتا تھا۔ اور جدھر نظر اٹھتی تھی۔ اُدھر ایسا قدرتِ کاملہ کا ظہور پاتے تھے۔ کہ طبیعت میں خواہ مخواہ عجیب رُوحانی جذبات پیدا ہوتے تھے۔ تناور درخت اپنی لمبی لمبی شاخوں کو ہاتھوں کی طرح پھیلاتے تھے اور اس قدرت کے شیدائی کو اپنی آغوش میں بلاتے تھے۔ چشمے اپنی لطف خیز روانی میں وُہ درد بھرا راگ سناتے تھے۔ جسے سوائے درد بھرے دل کے اور کوئی نہیں سنتا۔ کرشن جی اپنے وقت کا بیشتر حصّہ جنگلوں کی سیر ہی میں گذارا کرتے تھے۔ کبھی کسی چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ کبھی کسی درخت پر چڑھ گئے اور اُس کی چوٹی پر بیٹھ کر بانسری بجانے لگے۔ بانسری بجانے میں انہیں خاص کمال تھا۔ ان کے ہاتھ میں یہ بیجان چیز بالکل گویا ہو جاتی تھی۔ اور ایسی آوازیں نکالتی تھی۔ گویا اس کی رُوح پر صدمہ پہنچا ہے۔ نالۂ کرشن جی کی بانسری پر ہی صادق آتا تھا۔ وُہ تمام جذبات جو انکی اپنی بیچین طبیعت میں جوش مار رہے تھے۔ بانسری کے چاک سینے میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اور وہاں سے ان دردناک صداؤں کے پیرائے میں نکلتے تھے۔ جن کے سُننے سے ہر ایک شخص کا دل موم ہو جاتا تھا۔ انہیں اس کمال کا ہونا کچھ تعجّب خیز بات نہ تھی۔ کیونکہ ان کے کان اس موسیقی سے آشنا ہو گئے تھے جو تمام کائنات کی تہ میں ہے۔

مگر یہ سب باتیں خواب و خیال کی طرح گذر گئیں۔ ابھی کرشن جی کی عمر پُورے پندرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ راجہ کنس کو اس بات کی خبر لگ گئی۔ کہ دیوکی اور واسدیو کا فرزند زندہ سلامت ہے۔ اور گوکل میں پرورش پا رہا ہے۔ کنس کے مظالم کی وجہ سے اس کی رعایا سخت ناراض تھی۔ اس لئے اُسکا یہ تو حوصلہ نہ ہُوا۔ کہ کھلم کھلا کرشن جی کی موت کا حکم دیدے۔ مگر دل میں یہ ٹھان لی کہ متھرا بُلوا کے دھوکے سے مروا ڈالے۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ کرشن جی متھرا آئے۔ لیکن کنس اُنکا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ اُلٹا اُنکے ہاتھ سے خود قتل ہُوا۔ اور تمام ملک و مال انکے ہاتھ میں آگیا۔ مگر اب دُنیاوی جاہ و مرتبہ کی انہیں آرزو نہ تھی۔ گوکل ہی میں انکے خیالات روحانیت

کی طرف راغب ہو گئے تھے - اوہام پرستی اور اعتقادات باطلہ سے تو انہیں ابتدا سے نفرت تھی - جادون کے تخت پر کنس کے معتمر باپ اُگرسین کو بٹھا کر آپ تعلیم و تعلّم میں مشغول ہو گئے - اور راج پاٹ چھوڑ کر جنگل میں رہنا اور رشیوں کی صحبت اختیار کر لی - اس طرز زندگی کو اُنہوں نے صرف دو مرتبہ ترک کیا - ایک تو جب راجہ جسانده نے متھرا پر چڑھائی کی تو انہیں چار و ناچار اس کی سرکوبی کے لئے جانا پڑا اور دوسرے پانڈوں کے ساتھ ہو کر کوروں اور پانڈوں کی عظیم الشان جنگ میں حصہ لیا -

اگرچہ ہندو مورخ لکھتے ہیں - کہ مہابھارت کی لڑائی میں کرشن جی کسی کی طرف سے ہو کر عملاً نہیں لڑے - لیکن اس میں شُبہ نہیں کہ انکو پانڈوں سے ہمدردی تھی اور پانڈوں کی فتح زیادہ تر انہیں کی مناسب وقت صلاح اور عُمدہ مشورے کی بدولت تھی -

پانڈوں کی لڑائی سے فارغ ہو کر کرشن جی نے ارادہ کر لیا - کہ اب باقیماندہ حصہ عمر رُہبانیت کی زندگی ہی میں گذارینگے - اور اس لئے سب خویش و اقارب اہل و عیال کو الوداع کہہ کر جنگل میں نکل گئے - مگر اب ان کے اس منزلِ ہستی سے کوچ کرنے کا وقت آ گیا تھا - ایک دن ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے - کہ ایک شکاری کا تیر اتّفاقیہ ان کے پاؤں میں آ لگا - شکاری جب اپنی غلطی سے متنبہ ہوا تو بہت کچھ عذر معذرت کرنے لگا - اور دوا درمن کی تدبیر میں مشغول ہوا - مگر کرشن جی نے اس کی تشفی کی اور کہا کہ دوا سے اب کچھ فائدہ نہیں - قسمت میں یہ بات یونہی لکھی تھی - اس میں تمہارا بھی کچھ قصور نہیں - اسی قسم کی باتیں کرتے ہُوئے جہانِ فانی سے سدھار گئے - اور اپنے پیچھے ایک ایسا نام چھوڑ گئے - جو باوجود افترا پردازیوں سے زنگ آلود ہو جانے کے بھی ہمیشہ تک کندن کی طرح چمکتا رہیگا -

کرشن جی کی تعلیم زیادہ تر بھاگوت گیتا میں شامل ہے - اور یہ وہ نصیحت آمیز نظم ہے جو کرشن جی نے ارجن کو میدانِ جنگ میں سُنائی تھی - اس نظم کا فلسفہ بدھ مذہب کے فلسفے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہو اور اس لئے اس کا سمجھنا کچھ آسان کام نہیں - مگر علاوہ فلسفے کے اس میں بہت سے کارآمد نصائح اور بھی ہیں - چونکہ فی الحال ہمارا مقصد روحانیت کے جھگڑوں میں پڑنے کا نہیں اس لئے کرشن جی کی تعلیم

سے قطع نظر کرتے ہیں۔

ہاں ایک بات اس میں ضرور ہمارے لئے دلچسپی کا موجب ہے۔ وہ یہ کہ اس کا میلان وحدانیت کی طرف بہت زیادہ ہے۔

بہرحال کرشن جی کی تعلیم کی نسبت جو جسکا جی چاہے رائے رکھے مگر اس بات کے ماننے میں تو شاید کسی منصف مزاج شخص کو تامل نہ ہوگا۔ کہ وہ دنیا کے برگزیدہ آدمیوں میں سے ایک تھے وہ صفات جو ان میں پائی جاتی تھیں۔ ہر ایک بشر کے حصے میں نہیں آتیں۔ بلکہ خدا کی طرف سے خاص خاص لوگوں ہی کو عطا ہوتی ہیں۔ ؎ ایں شجاعت بزور بازو نیست + تانہ بخشد خدائے بخشندہ +

اختر دہلوی

جو تصویر آج ناظرین مخزن رسالے کے شروع میں دیکھتے ہیں۔ وہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے۔ یہ ایک مجمع احباب ہے۔ سوائے شیخ عبدالعزیز صاحب بی۔ اے ایڈیٹر اخبار آبزرور لاہور کے اس مجمع کے سب ارکان ایسے ہیں جن کے نام اور مضامین مخزن کے صفحات میں ناظرین مخزن نے بارہا پڑھے ہیں۔ میر نیرنگ صاحب بی۔ اے کا حسن بیان اُنکے کلام کی پختگی اور ان کا فلسفیانہ تخیل اکثر دلوں کے لئے تنہائی میں باعث تسکین ہوا ہے۔ زندگی کے بعض مسائل پر جو روشنی انکی شمع فکر نے ڈالی ہے۔ اور جو افسردگی آمیز مسرت اُنکے اشعار پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ انکی خصوصیت انداز کی کافی شہادت ہے۔ مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز بی۔ اے وکیل انبالہ کی نظمیں اپنی شیرینی اور تاثیر سے پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر کر چکی ہیں۔ میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کے مضامین نثر ہمیشہ نتیجہ خیز اور چستی عبارت اور بندش فقرات کے لحاظ سے قابل غور اور لائق تقلید ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالرشید چشتی بی۔ اے (مرحوم) کے مضامین مرحوم کی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے۔ اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے مسودات نظم و نثر ان اوراق میں حسرت و ارمان کے ساتھ شائع کئے گئے۔ یہ ایک غنچہ تھا کہ بن کھلے مرجھا گیا۔ یہ مرقع ہم کو اتفاق سے مل گیا ہے۔ چونکہ یہ صاحب آپس میں رشتہ محبت و صداقت سے وابستہ ہیں۔ اس لئے عین مناسب ہے کہ ان کی تصویر بھی چھاپی جائے۔ دوسری بات اس تصویر میں یہ ہے کہ سب کے سب دوست دوستانہ بے تکلفی کی بنا پر اس تصویر میں بڑی سادگی کی حالت میں ہیں +

زندگی کی محبّت

جُوں جُوں عمر گذرتی ہے اگرچہ اُس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری زندگی کے مقصُودہ حظائظ کم ہوتے جاتے ہیں مگر زندہ رہنے کی خواہش بڑھتی رہتی ہے۔ وُہ خطرات جنہیں جوانی میں ہم حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اب بڑھاپے میں نئی خوفناک صُورتیں بناکر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہی دُوربینی بھی بڑھتی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا دِل خوف کا دائمی مسکن ہوجاتا ہے۔ اور عمر کا باقی حصّہ ایسی بیکار کوششوں میں صرف ہوتا ہے جن سے ہمارا مقصُود یا تو انجامِ حیات (موت) سے بچنا یا حیاتِ ابدی کا حصُول ہوتا ہے۔

ہماری فطرت میں عجیب تناقض واقع ہوا ہے جس سے عُقلا بھی مستثنےٰ نہیں۔ اگر ہم اپنی آئندہ زندگی کا مقابلہ اپنی گذشتہ زندگی سے کریں تو منظر نہایت ہیبت ناک دکھائی دیتا ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ گذشتہ حظائظ سے ہمیں کوئی سچی خوشی حاصل نہیں ہُوئی۔ اور احساس یقین دلاتا ہے کہ گذشتہ حظائظ آئندہ کی لذتوں سے زیادہ مزیدار تھے۔ مگر تجربے اور احساس دونو کا عمل بے سُود ہوتا ہے۔ اُمید جو اِن دونوں سے زیادہ قوی ہے مستقبل کے منظر کو خیالی خوبصُورتی سے منوّر کرتی ہے اور کوئی نہ کوئی خوشی اس وسیع میدان میں ایسی نظر آجاتی ہے جو ہمیں دُور سے اشارہ کرتی ہے کہ "اِدھر میری طرف چلے آؤ"۔ پس ایک قمار باز کی طرح جتنا ہم ہارتے جاتے ہیں۔ ہماری ہر ایک ناکامیابی ہمیں اور زیادہ شوق دلاتی ہے کہ ہم اس قمار کو جاری رکھیں۔

تو پھر میرے عزیز! یہ روزافزوں (زندہ رہنے کی) خواہش کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے؟ یہ بات کیسے ہوتی ہے کہ ہم اپنے وجُود کے قائم رکھنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں اور پھر اس وقت جب اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے (بڑھاپے میں)؟ کیا یہ ہماری فطرت ہے جو بقائے نسلِ انسان کے لئے ہمارے زندہ رہنے

کی خواہش کو زیادہ - اور ہمارے حظائظِ زندگی کو کم - کرتی رہتی ہے - چونکہ یہ فطرت حواس کو ہر ایک خوشی سے محروم کردیتی ہے - قوتِ متخیلہ کو اس محرومی میں بلند پروازی کا خاصا سامان مل جاتا ہی - ایک ضعیف العمر کے لئے جو صد ہا قسم کی کمزوریوں کے بوجھ میں دبا ہوا ہو زندگی وبالِ جان ہو جاتی ہے - اگر وہ موت سے صرف اتنا ہی خائف ہو جتنا جوانی میں تھا - گھٹتی ہوئی طاقت کے بیشمار مصائب اور اُن خوشیوں کا مزا جو گذر چکی ہیں دفعتہً اس کو آمادہ کردیگا - کہ اس مصیبت کی زندگی کا اپنے ہی ہاتھوں سے خاتمہ کردے - مگر خوش اتفاقی سے اس کی (موت سے) لاپروائی اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے - اور اس وقت جبکہ یہ نہایت نقصان رساں ثابت ہوتی - اور زندگی اُسی نسبت سے جب اسکی اصلی قیمت کچھ نہیں رہتی ایک خیالی قیمت حاصل کرلیتی ہے -

ہمارے گرد کی ہر ایک شے سے ہمارا تعلق جُوں جُوں ہم اُن سے زیادہ اور زیادہ آشنا ہوتے جاتے ہیں بڑھتا جاتا ہے - ایک فرانسیسی حکیم کا قول ہے کہ "مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے کہ مَیں ایک ایسے کھمبے کو جس سے مَیں ایک عرصہ سے آشنا ہوں اُکھڑا ہوا دیکھوں" پس دل جب مختلف چیزوں سے مانوس ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود ان کے دیکھنے کا مشتاق ہوتا ہے - اُن سے ملتا تو ہے عادتاً - مگر جُدا ہوتا ہے طوعاً و کرہاً اسی وجہ سے ضعیف العمر اکثر ہر ایک قسم کی ملکیت کے حریص ہوتے ہیں - انہیں دُنیا سے اور کُل مخلوق سے محبت ہوتی ہے - انہیں زندگی سے اور اس کے تمام منافع سے محبت ہوتی ہے - اس لئے نہیں کہ وہ اس سے حظ اُٹھاتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اس سے مانوس اور دیر سے آشنا ہوتے ہیں -

شنو انگ جو معصوم کے نام سے مشہور ہے جب چین کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے حکم دیا کہ تمام قیدی جو سابقہ بادشاہوں کے عہد میں بے انصافی سے قید خانے میں اسیر ہیں فوراً رہا کردیے جائیں - اس آزاد کردہ تعداد میں سے جو بادشاہ کے تشکر یہ کے لئے آئے ایک بوڑھا بھی تھا - جو بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا - "اے چین کے بڑے مالک مجھ کمبخت کی طرف دیکھ! جس کی عمر اس وقت پچاسی برس کی ہے اور میں بائیس برس کی عمر میں جیلخانے میں قید کیا گیا تھا -

مجھ بیگناہ کو بغیر اس کے کہ میرے الزام لگانے والے میرے سامنے بھی لائے جاتے۔ قید خانے میں بھیجدیا گیا۔ میں پچّاس برس سے زیادہ تنہائی اور اندھیرے میں رہا ہوں اور اس مصیبت سے مانوس ہو گیا ہوں۔ اب اس سُورج کی چمک سے جس کا دیدار تیری بدولت مجھے نصیب ہوا میری آنکھیں چُندھیاتی ہیں۔ مَیں بازاروں میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ کہ شاید کوئی دوست ملجائے۔ جو میری مدد کرے مجھے تکلیف سے بچائے اور مجھے پہچانے۔ لیکن میرے دوست اور میرا خاندان سب کے سب مر گئے اور میرا کوئی بھی شناسا نہ رہا۔ اے شنوا ہنگ مجھے اجازت دے کہ مَیں اپنی بقیہ مصیبت کی زندگی بھی ایسی قید خانے میں گزاروں۔ میری اندھیری کوٹھری کی دیواریں مجھے اِن شان و شوکت کے محلوں سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ میری زندگی کے دِن اب تھوڑے ہی سے باقی رہ گئے ہیں۔ اور میں نہایت ناخوش اور رنجیدہ رہونگا اگر مَیں اسی قید خانے میں جس سے تونے رہا کیا ہے اور جس میں اپنی جوانی کے دن مَیں نے گذارے ہیں واپس نہ بھیجدیا جاؤں"۔

جیسا کہ یہ ضعیف العمر قید کا شائق تھا اسی طرح ہم بھی زندگی کے ہیں۔ ہم اِس قید خانے (دُنیا) سے مانوس ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ہم چاروں طرف ناراضگی سے نظر کرتے ہیں اور اس مسکن سے بیزار ہیں مگر ہماری قید کی طوالت ہماری اس قید خانے کی اُلفت کو بڑھاتی ہے۔ جن درختوں کو ہم نے لگایا ہے۔ جن مکانوں کو ہم نے بنایا ہے اور وُہ اولاد جن کو ہم نے جنا ہے۔ سب کے سب ہماری دُنیا سے بندش کو تنگ کرتے ہیں۔ اور ان سے علیحدگی تلخ معلوم ہوتی ہے۔ زندگی نوعمروں کو ایک نئے آشنا کی طرح لُبھاتی ہے۔ کیونکہ وُہ آشنا جسکی صحبت سے سیری نہ ہوئی ہو ہمیشہ پیارا اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پس زندگی مثل ایک نئے حبیب کی صحبت کے دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی پروا اِس صُورت میں بھی کم کیجاتی ہے۔ ہمیں جو بوڑھے ہو گئے ہیں زندگی مثل ایک دیرینہ دوست کے معلوم ہوتی ہے جس کی خوش مذاقیوں کا لُطف ہم پچھلی صحبتوں میں اُٹھا چکے ہیں۔ پس کوئی نئی بات ایسی پیش نہیں آتی جو تعجب انگیز ہو۔ تاہم ہمیں زندگی سے محبت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم ہر ایک لذت سے محروم ہوں لیکن ہماری اِس کے ساتھ محبت بدستور رہتی ہے۔ ضائع ہونے والے سرمائے کی حفاظت ہم روز افزوں اشتیاق

اور کفایت شعاری سے کرتے ہیں اور اس کی مہلک جُدائی کے سبب تمام صدمات کی تکلیفیں جھیلتے ہیں۔

سر فلپ موڈ ڈانٹ ایک نوجوان - خوبصورت - دلیر اور سچا انگریز تھا اول تو اُس کی اپنی ہی ذاتی جائداد بہتیری کچھ تھی اور پھر اس پر بادشاہ کا منظورِ نظر ہو گیا تھا - جو امر بذاتہ ایک دولتِ عظمیٰ سے کم نہ تھا - زندگی نے اپنے تمام (خوشیوں کے) خزانے اس کے سامنے کھول دیئے - اور آئندہ خوشیوں کے ایک غیر متناہی سلسلے کا یقین دلایا - اُس نے اکران لذائذ کا مزا چکھا اور فوراً اُن سے متنفر ہو گیا - زندگی سے اُسے نفرت ہو گئی - اُسی دائرے کے اندر بار بار پھرنا اُسے بارِ خاطر گذرا - اُس نے ہر لذت کا مزا چکھا اور دیکھا کہ دُوسری دفعہ اس میں وُہ مزا ہی نہیں رہتا - اُس نے اپنے دِل سے چلّا کر کہا "جب جوانی میں ہی زندگی ایسی بدمزہ ہے تو بڑھاپے میں کیا حالت ہو گی ؟ جب اِس وقت اس میں کچھ لُطف نہیں تو اُس وقت تو یقیناً وبالِ جان ہو جائیگی" - اس خیال نے اُس کے افکار کو تلخ بنا دیا - یہانتک کہ اُس نے اپنی گمراہ عقل کی ہدائت سے اس جھگڑے کا فیصلہ پستول سے کر دیا - اگر اس اپنی ذات پر دھوکہ کھانے والے شخص کو یہ معلوم ہوتا - کہ عُمر کے بڑھنے ہی سے ہماری زندگی کی محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے تو وُہ شاید بڑھاپے کا استقبال بلاخوف کرتا - وُہ زندہ رہنے کی جُرأت کرتا - اور اپنی آئندہ محنت سے اس سوسائٹی کی خدمت کرتا جس کو اُس نے تنگدلی سے خیرباد کہہ کر نقصان پہنچایا +

(ترجمہ از گولڈسمتھ)

لطیف احمد (از پانی پت)

ایک مُسکراہٹ - ایک مسکراہٹ کی قیمت کون بتا سکتا ہو؟ دینے والے کا اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا - لیکن پژمردہ خاطر - گنہگار - افسردہ دل اور بیکس کے حق میں یہ انمول ثابت ہوتی ہو - اس سے کینے کی آگ بُجھ جاتی ہو - برگشتہ رام ہو جاتے ہیں - نفرت محبت سے - انتقام مہربانی سے بدل جاتا ہو - اور تنگ و تاریک راستے - جواہرات کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے ہیں - خندہ پیشانی - نیکدل انسان - جانی دوست - محبت کرنیوالے بھائی - تابعدار بیٹے اور مہربان شوہر کی نشانی ہو - اس سے حُسن دوبالا ہو جاتا ہو - بدصُورتی پر پردہ پڑ جاتا ہو - اور حسین عورت بہشتی فرشتوں سے مشابہ ہو جاتی ہے +

اہلِ قلم کی اپیل

(اہلِ رسالہ کی خدمت میں)

آج کل چشمِ بددُور رسالوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں کھڑی ہوگئی ہیں اور ہم غریب اہلِ قلم پر وُہ دھواں دھار چاند ماری ہورہی ہے کہ الامان والحفیظ - ناچار تابِ مقاومت نہ لاکر ہم مخزن کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں اور اس رسالے کے کمان افسر کی خدمت میں بہ ادب عرض کرتے ہیں کہ ع اے صبا ایں ہمہ آوردہ تست

رسالوں کی تعداد میں یہ روز افزوں ترقی ایک لحاظ سے تو فال نیک ہے اور اس سے ادب اُردو کی ترقی کی توقع ہوتی ہے مگر ایّام غدر کی سی بیقاعدہ فوج سے قلعہ کشائی کی اُمید رکھنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں - بندوق میں گولی نہیں جھولے میں روٹی نہیں - قواعد پریڈ کی فرشتوں کو خبر نہیں اور چلے میرے جنگی کشور کشائی کو ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

شیخ جہانیاں جہاں گشت نے جب پہلے پہل مخزن نکالا تو خُلق سے مُروّت سے حیلے سے فریب سے راز و نیاز سے ساز و باز سے ہم سب سادہ لوح اہلِ قلم کے مچلکے لکھوالیئے اور عہد و پیمان کی زنجیروں سے ایسا جکڑا کہ کسی میں جُنبش کی سکت باقی نہ رہی - اِدھر شیخ کی چرب زبانی اُدھر مخزن کی ہولستانی غرض کچھ ایسے اسباب جمع ہوگئے کہ کلکتے سے پشاور اور کشمیر سے حیدر آباد دکن تک سب اہلِ قلم شیخ کے مسخر ہوگئے - حضرت تو اپنا جادو منتر چلاکر چلتے بنے اور ساتوں سمندر سے پار ہوگئے مگر منتر اپنا کام کر رہا ہے اور کرتا رہیگا -

مخزن کے دیکھا دیکھی درجنوں رسالے نکل آئے - اور کوڑیوں نکلتے چلے آتے ہیں - جو نیا رسالہ نکلتا ہے اس کی ایک کاپی بڑے لمبے چوڑے اشتیاقیہ خط کے ساتھ ہمارے پاس بھیجی جاتی ہے اور قلمی اور جیبی امداد کا تقاضا کیا جاتا ہے - سچ پوچھو تو ہم کچھ ایسے بڑے لکھنے والے بھی نہیں - ہماری بندشیں ڈھیلی قافیے غلط اور نیم انگریزی نیم فارسی سٹایل آدھا تیتر آدھا بٹیر کا مصداق پایا جاتا ہے -

مگر ہمارے قدردان ہیں کہ لٹو ہوئے جاتے ہیں ہم اہل قلم کی آمدنی عموماً سات سے ستر روپیہ ماہوار تک ہوتی ہے اس سے جس کی زیادہ آمدنی ہو وُہ اہل دولت ہے اہل قلم نہیں - اور جس دماغ میں نشۂ دولت ہو وہاں سے ذوقِ علمی اپنا بسترِ اُٹھالیا کرتا ہے - اور اہلِ دولت کی تصنیفات میں وُہی مزہ آتا ہے جو .... صاحب کی غزلوں میں - حاصل کلام یہ ہے کہ ہم لوگ دولتمند نہیں اور جب دولتمند نہیں تو ایک کوڑی رسالے جو ہمارے تخمینہ میں پانچ کوڑی کے بھی نہیں کیونکر خریدیں - اور اس کے ساتھ ہی اگر ہم قلمی امداد بھی ان سب کی کریں تو دُنیا کے اور کاروبار کس وقت کریں اور کاروبار چھوڑدیں تو کھائیں کہاں سے - آپ کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا و مافیہا کی اصلاح کا بارِ امانت آپ نے اُٹھا لیا ہے مگر سچ فرمایئے کہ اس رسالے کی فتوحات سے آپ اپنا پیٹ نہیں پالتے - کیا یہ انصاف ہے کہ آپ کی ضیافتِ طبع اور ضیافتِ شکم کے لئے ہم خُونِ جگر بہائیں اور اس کا کچھ معاوضہ نہ ہو آج کل رسالوں کی کثرت کی وجہ سے ہمارے وقت کا ایک معتد بہ حصّہ انکاری خطوط میں ضائع ہوتا ہے مگر صاحبِ رسالہ اور صاحبِ اخبار اس انکار کو تسلیم نہیں کرتے اور مکرر سہ کرر لکھتے ہیں جس میں کچھ نرمی ہوتی ہے کچھ گرمی کچھ دھمکی کچھ تھپکی - یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ "مخزن کے لئے تو آپ کے پاس وقت ہے مگر ہمارے لئے نہیں ہم بھی تو آپ کے پُرانے نیازمندوں میں ہیں"۔ یہ آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے اور آپ کی خدمت میں ہم کو بھی نیازمندی کا دعویٰ ہے - مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخزن یا کسی اور پرچے کے ساتھ جو ہمارا سابقہ معاہدہ ہے اسکو اس وجہ سے فسخ کر دیں کہ آپ نے بھی ایک رسالہ نکالا ہے جس کی قلمی امداد کی ہمیں فرصت نہیں اور جس کا پڑھنا شاید مُفت میں بھی ہم کو گوارا نہیں -

بندہ نواز! اگر پولٹیکل اکانومی کے اصولِ تقسیم محنت کو آپ ملاحظہ فرمائینگے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہم غریب اہلِ قلم پر آپ بیجا سختی کر رہے ہیں - اگر آپ خریداری کے لئے ہم کو لکھتے ہیں تو صاف صاف لکھئے اور قلمی امداد کا معاملہ علیحدہ رکھئے - اگر ہمارے پاس کافی ٹکے ہونگے اور ہم آپ کے رسالے یا اخبار کو اس قابل سمجھیں گے کہ کچھ ٹکے اسپر خرچ کیے جائیں تو آپ کی

خدمت میں خریداری کی درخواست بھیجدینگے۔ ورنہ ہرگز آپ اپنا قیمتی رسالہ نہ بھیجیں۔ اور اگر آپ قلمی امداد چاہتے ہیں تو اس کا اقل معاوضہ یہ ہے کہ آپ پرچہ مُفت بھیجیں۔ آپ کے پرچے کی سالانہ قیمت دو تین روپے ہے اور اگر ہمارے ریختۂ قلم کی اتنی بھی قیمت نہیں تو تُف ہے ہماری قلم رانی پر اور حیف ہے آپ کی قدردانی پر۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کوئی اہل قلم اپنی رضامندی سے کسی پرچے کی قیمت ادا کرتا رہے مگر ویلیو پے ایبل پارسل بھیجنا اور قلمی امداد کے لئے اصرار کرنا سخت بے انصافی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اہل قلم جن میں ایک بندۂ درگاہ بھی ہے قلمی امداد کے معاوضے میں مُفت پرچہ لینا بھی پسند نہ کریں اِس لئے اس بات کا بھی شروع میں تصفیہ ہوجانا چاہئے۔ اور جب کوئی بھلا مانس کسی مجبوری کی وجہ سے اِنکار کر دے تو اس کو قبول فرمالیا کریں اور خط وکتابت کو طول دیکر بیچارے قلم زن کو کج خلقی یا سکوت پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ اعلان عام اس غرض سے شائع کیا جاتا ہے کہ اہل رسائل و اہل اخبار اہل قلم کے حقوق سے واقف ہوں اور یک طرفہ ڈگری اُن پر نہ کیا کریں۔

راقم بندۂ قلم بازخان

مطالعۂ تواریخ مذہب کے بعد انسان کی اصلاح کے واسطے کوئی شے علم سے بڑھ کر نہیں۔ اگر فلسفے کی خاردار جھاڑیوں کو ہاتھ لگاتے ہُوئے ڈرتے ہو تو مطالعہ تواریخ میں تو کوئی اندیشہ نہیں۔ اِس سے بڑھکر آسان کام کیا ہوگا۔ جس میں تفریح اور فائدہ دونوں موجود ہیں۔ ایسے شخص کو دیکھ کر ہمیں کیسا افسوس ہوتا ہے جسکی گردن اکڑ گئی ہو اور پیچھے مُڑکر نہ دیکھ سکے۔ لیکن وُہ شخص جو گذشتہ کارہائے نمایاں سے بے خبر ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر قابل رحم ہے۔ تواریخ نوجوان کو بغیر جھریوں اور سفید بالوں کے بڈھا بنا دیتی ہے۔ اس سے بڑھاپے کا تجربہ بغیر بڑھاپے کی تکلیفوں کے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ صرف ماضی کو حال ہی نہیں بنا دیتی۔ بلکہ آیندہ کی بھی خبر دیتی ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں کوئی بالکل نیا واقعہ نہیں پیش آتا۔ ہر ایک چیز ایسی ہی نئی ہوتی ہے جیسے کہ نیا چاند۔ جو اصل میں محض پُرانا چاند بدلی ہوئی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح پُرانے واقعات بھی بار بار نئی نئی اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

ریویو

معین الآثار - المعروف بہ تاریخ آگرہ - موسومۃ الصدر کتاب کے مصنف محمد معین الدین صاحب اکبرآبادی جنرل سپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا ہیں - اس سرتاج عمارات روضۂ تاج محل اور آگرے کی دیگر مشہور قدیم عمارات کا تاریخی حال وکیفیت نہایت شرح وبسط کے ساتھ رقم کی گئی ہے - مصنف نے حالات اور واقعات کے فراہم کرنے میں بہت کچھ کوشش کی ہے اور متعدد انگریزی فارسی اردو کتب سے مدد لی ہے علاوہ معنوی خوبیوں کے ظاہری حیثیت بھی دلکش ہے - ہاف ٹون تصاویر کی خوبصورتی ونفاست خصوصاً قابلِ تعریف ہے - یہ کتاب بہ قیمت عہ مصنف دیا محمد فخرالدین صاحب ساکن کچہری گھاٹ آگرہ سے مل سکتی ہے

قندِ پارسی - محمد احسن اللہ خان صاحب ثاقبؔ رئیس آگرہ نے ملک میں زبانِ فارسی کا مذاق پھیلانے کے لیئے علیگڈھ سے یہ ماہوار رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے - ہمیں کامل امید ہے کہ جناب ثاقبؔ اس رسالے کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرینگے - پہلا نمبر خاصہ دلچسپ ہے - مگر مضامین کے اسلوب و طرزِ تحریر میں قدیم رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے - اگر ایران کی موجودہ زبان کے بھی کچھ نمونے ہوں تو یقین ہے کہ رسالے کی دلچسپی دوبالا ہو جائیگی - حجم سولہ صفحے علاوہ سرورق اور لکھائی چھپائی عمدہ - چندہ سالانہ عہ - درخواست بنام ایڈیٹر رسالہ "قندِ پارسی" علیگڈھ ہو +

جنگِ روس و جاپان - اس نام کی ایک کتاب مطبع مطلع العلوم مرادآباد سے شائع ہوئی ہے جسے سید محمد ابراہیم صاحب عجمی نے ترتیب دیا ہے - چونکہ ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو اس جنگ سے دلچسپی ہے اس لیئے اس کتاب کا مطالعہ پبلک کے لیئے خالی از مفاد نہ ہوگا - جنگ کے اسوقت تک کے حالات خوب وضاحت سے لکھے ہیں - اور علاوہ ازیں یہ کتاب جنگ کے متعلق ہر قسم کی واقفیت مہیا کرتی ہے - قیمت ۸ر - درخواست بنام ایڈیٹر صاحب اخبار نیرِ اعظم مرادآباد ہونی چاہیئے

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اِک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اِک پتنگا
وُہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دیکر تعلیمِ خامشی دی

نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی

اک مشتِ گل میں رکھا احساس کا شرارہ
انساں کو آگہی کی ظلمت کو چاندنی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وُہی ہے جو رات ہو ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وُہ سخن ہے غنچے میں وُہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دِل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال

صبح کا ستارہ

لطف ہمسائیگی شمس و قمر کو چھوڑوں
اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں

عارضی حسن ہے دشمن ہے مرا نور سحر
یہ ملا خسروِ خاور کا پیامی بن کر

میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی

آسماں کیا عدم آباد وطن ہے میرا
صبح کا دامن صد چاک کفن ہے میرا

میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا

نہ یہ خدمت نہ یہ عزت نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا تو نہ اختر بنتا
قعر دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا
چھوڑ کر بحر کہیں زیب گلو ہو جاتا

ہے چمکنے میں مزہ حسن کا زیور ہو کر
زینت تاج سر بانوئے قیصر ہو کر

ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبہ جاگا
خاتم دست سلیماں کا نگیں بن کے رہا

ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست
ہے گہرہائے گرانمایہ کا انجام شکست

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل
کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں ہوں
کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں ہوں

اشک بن کر سرِ مژگاں سے اٹک جاؤں میں
کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں

جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور
سوئے میدانِ وغا حبِّ وطن سے مجبور

یاس و اُمید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو
جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو

جس کو شوہر کی رضا تابِ شکیبائی دے
اور نگاہوں کو حیا طاقتِ گویائی دے

زرد رخصت کی گھڑی عارضِ گلگوں ہو جائے
کششِ حُسن غمِ ہجر سے افزوں ہو جائے

لاکھ وُہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
دل سے مانندِ مئے تند چھلک ہی جاؤں

صبر کا خون نکل آیا ہو رل کر مُجھ میں
ایک طُوفان ہو افکار کا مضمر مجھ میں

خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

اقبال

وجد و سماع

وجد میں ہے پیکرِ خاکی کہ ہو عرش آشیاں
شہپرِ پروانہ ہے کھولے ہُوئے شہبازِ جاں

بند آنکھیں ہیں کمیں گاہیں پئے عنقا شکار
رقصِ صوفی آہوئے رم خوردہ ہے ضیغم سوار

جوشِ بیتابی ہے - موجِ عالم آشوبی نہیں
ہاں - لگد کوبِ علائق ہے یہ پا کوبی نہیں

بیقراری ہے دلِ بیتاب کی منزل رساں
دستِ بالا کشتیٔ دل کے لئے ہے بادباں

مجلسِ وجد و سماعِ جاں فشاناں بوتہ وار
قلب سے کرتی ہے نقدِ قلب کو کامل عیار

یہ وُہ آتش ہے کہ آپ اپنی آپ جاتی ہو سُلگ
یہ وُہ آتش ہے کہ اس سے صاف لگ لپٹ الگ

یہ وہ آتش ہے دلِ دریا میں بھی ہو اس کا گھر
شاہدِ رقصِ روانیٔ موجِ دریا سر بسر

ہے اِسی شُعلے سے روشن رقصِ فانوسِ فلک
پردۂ رقصِ صنوبر میں ہے رقصاں خاک تک

اُشتر و آہو و گاؤ و اژدہا و مار و مور
دم بخود ہیں وادی و کہسار و دشت و خاکِ گور

چہچہے ہیں طائرانِ باغ کے اس پر گواہ
وجد و حال و کیف سے لبریز ہے یہ خانقاہ

خامشی در پردہ ہے ساز و نوائے بیخودی
بیخودانہ ہے یہاں جو ہے صدائے بیخودی

بے بجائے آپ بجتا ہے یہ سرِ آہنگِ ساز
چھیڑتی ہے دل نفیرِ نَے یہاں بے نَے نواز

بے مَے و ساقی سرورِ بزمِ نوشا نوش ہے
بے نَے و مطرب سرودِ پردہائے گوش ہے

نغمہ پرواز ہوائے شوق ہے دمسازِ سیل
تارِ جاں پر زخمۂ مضراب ہے آوازِ سیل

یعنی پابندِ صدائے ساز یہ مستی نہیں
بے سرِ مستی مگر ہنگامۂ ہستی نہیں

قطرہ تا دریا ہے سرگرداں اسی سرجوش سے
ذرہ تا خورشید ہے رخشاں اسی سرجوش سے

ہے گلِ یک جلوہ برقِ خرمنِ صد شمعِ طُور
اک تبسّم ہے بہارِ صد گلستانِ ظہور

ایک اشارہ ہے صد آہنگِ نویدِ کامِ دل
اک نگاہِ شوق ہے صد دفترِ پیغامِ دل

عقدۂ سربستۂ دل ہے گر بابِ فتوح
بستۂ خار و خس وادی یہاں طُوفانِ نوح

جلوۂ گلزارِ ابراہیم اس آتش سے ہے
سرکشیٔ ہاؤ ہُو اس شعلۂ سرکش سے ہے

اِس سے خالی آتش و آب و ہوا و گِل نہیں
دل جو ہو بے کیف کم از مشتِ گِل ہو دل نہیں

حافظ سید فضل حق آزاد

لمودری

ذیل کی مستانہ اور مستی انگیز نظم حضرت ناظر کی نواسنجیوں کا ایک تازہ نمونہ ہے۔ کیوں نہ ہو جو بلبل کشمیر جنت نظیر جیسے چمن میں بسیرا کرے۔ اگر وہ ایسی رنگین نوائی نہ کرے تو اور کون کرے۔ نہر لمودری وادی لدر میں نگاہ نظارہ جو کے لئے ایک کانِ حُسن ہے۔ حضرت ناظر لکھتے ہیں "نہر لمودری کا سلسلہ نسب کوہ ہمالیہ سے ملتا ہے اور وہ شیشرم ناگ کے بطن سے پیدا ہو کر برف کے پنگوڑے اور مخمل کے بچھونے پر لوٹ لگاتی ہنستی کھیلتی وادی کشمیر کی طرف چلی آتی ہے۔ لمودری کے چاہنے والے زیادہ تر یورپین سیاح ہیں.... .... پہل گام سے عیش مقام تک لمودری کا گذرگاہ نہایت دلکش منظر ہے اور ناظرین کے دلوں میں عجب ولولہ پیدا کرتا ہے .... ایسی فضا دیکھ کر اگر ایک شاعر .... گنگنانے لگ جائے تو قابل معذوری ہے۔ پہلے بند میں شاعر لمودری کا سراپا بیان کر کے مجاز سے حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔ اور گہرا غوطہ لگاتا ہے"۔ ہم بلا تمہید مزید اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

کیا آب و تاب تجھ میں نہرِ لمودری ہے
پربت کی تو ہی دیبی یا قاف کی پری ہے
آبِ حیات ہے تو روحِ نبات ہے تو
تو جان و دل کی ٹھنڈک اور آنکھ کی تری ہے
تو کھیلتی ہے بن میں اور لوٹتی چمن میں
نسرین و نسترن میں تیری مصوری ہے
گلنار وہ رنگیلی شالی وہ پیلی پیلی
ریحاں وہ نیلی نیلی کیا صنعِ داوری ہے

رخشندہ سنگ پارے ہیں چاند یا ستارے
تیری جو کنکری ہے الماس سے کھری ہے

لعل و گہر کے معدن ہیں تیرے جیب و دامن
اور موتیوں سے ہر دم جھولی تری بھری ہے

چشمے ترے مقطّر ہیں جامِ جم سے بڑھکر
چیلوں کی فوج سر پر سدِ سکندری ہے

برف آب سے لبالب ہر دم ہے تیرا ساغر
ساقیٔ بزم تیرا خورشیدِ خاوری ہے

حُسن و جمال تیرا غنج و دلال تیرا
ہر خط و خال تیرا طغرائے دلبری ہے

ہے تیری دُھن نرالی کیا دِل لُبھانے والی
جنگل میں کوئی جوگن محوِ نوا گری ہے

ناظرؔ کی ہیں نظر میں تیری ادائیں پیاری
کچھ مجھ سے ملتی جُلتی ہے داستاں تمہاری

ہم دو نو جادہ پیما صبح و مسا رہے ہیں
بے راہبر رہے ہیں بے رہنما رہے ہیں

آفاق گرد دونو صحرا نورد دونو
ٹیلوں میں جنگلوں میں چکر لگا رہے ہیں

اپنی الاپ پر ہیں ہم دو نو مست و شیدا
سر دُھن رہے ہیں خود ہی اور خود ہی گا رہے ہیں

نے کوئی ہمزباں ہے نے کوئی رازداں ہے

پربت کی چوٹیوں کو ٹھکرا رہے ہیں

بانگِ جرس ہیں خود ہی اور خود ہی کارواں ہیں
ہم کوچ کا نقارا ہردم بجا رہے ہیں

یہ بیخودی و مستی وہی ہے اور الستی
روزِ ازل کے کیفی سرخوش سدا رہے ہیں

ہم گل کے ہم نفس ہیں بادِ صبا کے ہمدم
مرغانِ خوش نوا کے ہم ہم نوا رہے ہیں

اے اہلِ شہر تم سے مل کر ہوئے مکدر
صحرا نوردیوں میں ہم باصفا رہے ہیں

گردن کشوں سے دونو ہم کوسوں بھاگتے ہیں
جانب فروتنوں کی خود کھنچتے جا رہے ہیں

قدرت کے شاہدوں کے فوٹو اُتارتے ہیں
جو صورتیں ہیں دیکھی سب کو دکھا رہے ہیں

آئینہ وار بر دل نقش و نگار داریم
ہم شورہ بوم داریم ہم لالہ زار داریم

ہم کو بکو پھرے ہیں اور جابجا رہے ہیں
تحت الثرےٰ رہے ہیں فوق السما رہے ہیں

اونچی تھی اپنی بستی لیکن یہ غول ہستی
سوئے حضیض پستی ہم کو گرا رہے ہیں

آفت کا سامنا ہے یاں سیدھی راہ چلنا
منہ آکے پتھروں پر ہم منہ کی کھا رہے ہیں

ہیں گرم رہ نوردی گو اس سے بے خبر ہیں
آئے تھے کس طرف سے کس سمت جا رہے ہیں

دل جس جگہ لگانا واں لوٹ کر نہ آنا
کیا داغ حسرتوں کے ہم دل پہ کھا رہے ہیں

جو دلکش نظارے نظروں سے چھپ چلے ہیں
حسرت بھری نگاہیں اُن پہ اُٹھا رہے ہیں

ہے آب و تاب اپنی اہلِ جہاں پہ ظاہر
پر زخمِ اندروں کو سب سے چھپا رہے ہیں

وُہ مانے یا نہ مانے لیکن جبیں کو اپنی
ہم سنگ در پہ اس کے ہر دم گھسا رہے ہیں

اِک بحرِ بیکراں میں اپنا نشاں کریں گم
گرتے اُچھلتے پڑتے اِس دُھن میں جا رہے ہیں

اے موجِ یم خدارا تیور پہ بَل نہ لانا
ہم سر کے بَل تمہارے قدموں میں آ رہے ہیں

ناظر زمنزلِ دوست نام و نشاں ندانیم
در شوق راہ پیما دُنبالِ کاروانیم

وُہی عاقل ہے جو نیکی کا نہ جادہ چھوڑے مال مصرف سے کفن کے نہ زیادہ چھوڑے
نفسِ امّارۂ بدخو کا ارادہ چھوڑے ورقِ دفترِ اعمال نہ سادہ چھوڑے

کھالے کچھ۔ گور کے پھر منہ کا نوالہ ہوگا
قبر میں فوج نہ ہوگی نہ رسالہ ہوگا

(منشی لعل علی ذی ہُنر) ... جہ

بارہ دری

(پٹیالہ)

چشم بد دور مناظرِ قدرت اور عجائباتِ عالم پر غائر نظر ڈالنے والے حقائقِ اشیا کی تحقیق میں بہت ترقی کر رہے ہیں۔ جنہوں نے معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیدۂ حقیقت بین سے غور کے ساتھ دیکھا بھالا اور جسکو مناسب سمجھا سلکِ تحریر میں منسلک کیا۔ چنانچہ "ندی" اور "شبے" کے راگ گائے۔ "ہل" کی سرگذشت بیان کی۔ "پرانی دیوار" سے ناصح مشفق کا کام لیا۔ "بلبل شیدا" سے ناز و نیاز کی باتیں کیں۔ "روانیٔ آب" پر بحرِ تموّجِ طبیعت کا زور دکھایا۔ "خار" کو رشکِ گلزارِ پُر بہار ثابت کر دکھایا۔ یہاں تک کہ "سوتا مٹھ" اور بی "کانگڑی" خانم بھی حضیضِ گمنامی سے نکل کر سطحِ علمی پر جلوہ افروز ہو گئی۔

چونکہ خاکِ پٹیالہ میں بھی کئی گوہرِ آبدار پنہاں ہیں۔ اس لئے راقم ہمیشہ اس بات کا متمنّی اور آرزومند رہا۔ کہ کوئی بلند و قلم۔ عالی دماغ۔ اور کہنہ مشق ہاتھ اس نامور ریاست کے قابلِ ذکر مصنوعاتِ انسانی کا مرقع کھینچکر اربابِ نظر کے پیش کرے مگر افسوس میری یہ آرزو بر نہ آئی۔ آخر ان عجائبات پر توجہ نہ کرنا اپنی حق ناشناسی اور انکی حق تلفی سمجھکر اس اہم فرضِ خدمت کا مہتم بالشان حصہ اضطراراً مجھے اپنے ذمّے لینا پڑا۔ بہر حال میں ریاست کے عجائبات کو معرضِ تحریر میں لانے کی داغ بیل ڈالتا ہوں۔ وَکَفیٰ بِہٖ فخراً۔ (مصنف)

مجھ سے بیدل کو کیا محو تماشائے چمن ۔ بل بے پٹیالہ تری بارہ دری کا جوبن
حبذا شان زہے حُسنِ فضائے گلشن ۔ واہ یہ تازگی و رونق و نزہت یہ پھبن
بارک اللہ یہ منظر یہ مقامِ دلکش ۔ چشم بد دور یہ گل بوٹے یہ سبزہ یہ چمن
خوش اللہ یہ نقشہ یہ سوادِ مینو ۔ واہ یہ پٹڑیاں صاف۔ اور یہ سڑکیں روشن
دیکھ پائے اگر اس باغِ بہار افزا کو ۔ حُسنِ پیرس ہو فدا اور فضائے لندن
روِشیں صاف ہیں یا تختۂ بلّور سمجھے ۔ کیاریاں ہیں کہ بھرے رکھے ہیں پھولوں سے لگن

غیرتِ باغ ہے گملوں میں بہارِ تازہ   اور گُل دانوں میں گلدستے ہیں رشکِ گلشن
واہ رے فیضِ ہوا نرگسِ اعمیٰ ہو بصیر   گر لگالے وُہ کبھی خاک کا اس کی انجن
بن گیا ہے وُہ سویدائے دلِ لالہ۔ یہاں   آج تک کہتے رہے داغ جسے اہلِ سخن
بیدِ مجنوں ہے اگر سر کو جھکائے بہ ادب   سرو قد۔ سرو کھڑا ہے پئے تعظیمِ چمن
چشم براہ اگر رہتی ہے نرگس ہر دم   ہر گھڑی گوش بر آواز ہیں نسرین و سمن
بل بے خودداری کبھی سیب زمیں پر نہ گرے   کششِ ثقل یہاں کر تو دے ثابت نیوٹن
نرم شاخیں ہیں نسیمِ سحری سے ہلتی   نشے میں جھومتا ہے یا کہ کوئی نازک تن
چھونے سے گویا چھوئی مُوئی مری جاتی ہو   سر جھکا بیٹھتی ہے شرم سے جس طرح دلہن
لا کلام اس کا ہر اک نخل ہے سرو و شمشاد   اس کے ہر برگ پہ لاریب فدا سو سوسن
اس گلستاں کا ہر اک گل ہے بسانِ گلزار   اس چمن زار کا ہر برگ ہے مانندِ چمن
اس حدیقے کی ہر اک شاخ میں ہے سو خوبی   اس کے ہر غنچہ و گل میں ہے بھری لاکھ پھبن
کمپنی باغ تو کیا ہیچ ہے باغِ لارنس   شالا مار اس کے مقابل میں نظر آتا ہے بن
مشرقی رنگ میں نیرنگیِ مغرب شامل   گر ہے یہ پارک تو پٹیالہ سراسر لندن
آسٹریا و اٹلی کے شجر اس میں نہال   گویا انگلینڈ کے پودوں کا یہ گلشن ہے وطن
اس میں یہ کوٹھی حضوری ہے کہ قصرِ ابیض   ہوس آف لارڈز بھی شرمائے نہیں اس میں سخن
روشیں سامنے اس کے جو بنی ہیں پُر لطف   ۱ لائے تحریر میں آسکتی نہیں وُہ بن ٹھن
سادگی میں ہے تکلف پے نظارہ غضب   ۲ لوٹ جاتی ہے نظر پڑتے ہی اس پر چتون
پٹریاں سُرخ بنے واڑے جن میں ہیں سفید   ۳ جس طرح ساعدِ گل گوں میں بلوریں کنگن
سنگریزے ہیں سفید اور سیاہ دونو طرف   ۴ کوڑیالی کوئی لہرا رہی ہے یا ناگن
اک طرف کوہ بنایا ہے بلند و سرسبز   ۱ کرنے اس باغ کا یا آیا ہمالہ درشن
ماشاء اللہ عجب صنعتِ انسانی ہے   ۲ اصل اور نقل میں کچھ فرق نہیں ہر من و عن

۳ گھاٹیاں وُہ ہی - وہی کھوہیں سلیں بے ترتیب ۔۔۔ پتھروں سے وہی پانی کا نکلنا چھن چھن
۴ سخت ویسی ہی زمیں وُہ ہی درختوں کے ہیں جھُنڈ ۔۔۔ کہیں روئیدہ بنفشہ - کہیں سنبل - سوسن
۵ آبشاروں سے صدا آتی ہے نغموں کی کہیں ۔۔۔ ہے ہوا گویا درختوں میں بجاتی ارگن
۶ اپنی دھُن میں کہیں قمری ہے جھنجھوٹی گاتی ۔۔۔ اور تدرو اپنا کسی سمت دکھاتا ہے چلن
۷ قُلّۂ کوہ پہ یہ کُنڈلی مارے ہے سانپ ۔۔۔ یا جٹا دھاری جی بیٹھے ہیں تجے تن من دھن
۸ ہے تہِ کوہ رواں چشموں سے یہ نہر - کہ ہے ۔۔۔ موج زن نیچے ہمالے کے یہ دریائے جمن
۹ ہے کہیں شیر جھُکا پینے کو پانی اس میں ۔۔۔ گائے چرچگ کے کہیں بیٹھی ہے پتھر پہ مگن

منظرِ کوہ غرض یہ کہ عجب منظر ہے ۔۔۔ شاد ہوتا ہے یہاں آکے گرفتارِ محن
کیوں نہ ہو - فیض سے کس کے یہ ہوا ہی سرسبز ۔۔۔ اس پہ ذی جُود رہا کون سا ہی سایہ فگن
آبیاریِ توجہ رہی کس کی اس پر ۔۔۔ لُطفِ شاہانہ سے کس کے یہ بنا ہی گلشن
کس کے ارشاد سے اس باغ کی اصلاح ہُوئی ۔۔۔ کون فردوس مکان تھا ہے یہ جس کا مسکن
راجہ اندر وُہ مہاراجہ راجندر سنگھ ۔۔۔ جی - سی - ایس - آئی جگر گوشۂ عظمیٰ برٹن
وہ سپاہی منش و شاہ صفت بندہ نواز ۔۔۔ دُھوم پٹیالے سے تھی جسکی مچی تا لنڈن
جس گلستاں کو نصیب ایسا چمن آرا ہو ۔۔۔ کیوں نہ ہر طرح سے کہلائے وُہ یکتائے زمن
اس کے اِک قصر پہ سو قصرِ خورنق قرباں ۔۔۔ اِس کے ہر پھُول پہ ہوں لاکھ فدا باغِ عدن

سیّد علمدار حسین (بزمی)

تلاشِ محبّت

(ایک بلّی کے بچّے کو دیکھ کر)

اس قدر بیچین کیوں پھرتی ہو اے ننھی سی جاں ۔۔۔ شور سے سر پر اُٹھا رکھا ہے کیوں سارا مکاں

دودھ پی لے بھوک نے تجھ کو ستایا ہے اگر
وہ دھرا ہے وہ دیکھ چھوٹی سی پیالی میں اُدھر

دودھ بھی پیتی نہیں تو؟ خیر لے تیرے لئے
گوشت تھوڑا سا منگا رکھا ہے یہ بازار سے

گوشت کو بھی تو نہیں چھوتی؟ تو کوئی کیا کرے
ہاں! ستایا ہے کہیں سردی کی شدت نے تجھے

آ رضائی میں تجھے اپنی بٹھا لیتا ہوں میں
آ تجھے سردی کے حملے سے بچا لیتا ہوں میں

پر یہاں بھی بیٹھ کر تجھ کو کہاں آرام ہے؟
تلملانے سے تڑپنے سے یہاں بھی کام ہے

بیٹھ کر گھٹنے پہ غوں غوں کرنے لگتی ہے کبھی
سر کو میرے پاؤں پر تو دھرنے لگتی ہو کبھی

پیار کرتا ہوں تو اُس پر بھی نہیں تجھ کو قرار
ناشکیبائی ہے تیری حرکتوں سے آشکار

کس قدر اُلفت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!
ہائے کیا حسرت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!

ہائے اے نادان! اب سمجھا میں ترا مدعا
تو تلاشِ مہر و اُلفت میں ہے آتش زیر پا

ڈھونڈتی پھرتی ہے ہاں وہ گوہرِ نایاب تو
جس کی ہر انساں کو ہم جنسوں میں ناحق جستجو

تجھ کو تو جس چیز کی ہے ابنِ آدم میں نہیں
بلکہ سچ پوچھے تو موجوداتِ عالم میں نہیں

آئے گا تیری سمجھ میں کس طرح یہ فلسفہ
ذوقِ راحت ہے تو پیدا کر دلِ بے مدعا

ہے تمنائے محبت ایک نخلِ بے ثمر
آرزوئے مہر و اُلفت ایک شامِ بے سحر

بلبلِ شیدا ہوائے گل میں صرفِ نالہ ہے
داغِ مہرِ گل سے دل اُس کا بہ رنگ لالہ ہے

ہے دلِ بلبل میں گل کی سرد مہری کی جلن
کیا خبر اُس کو کہ گل کے دل میں ہو کس کی لگن

کس کی فرقت میں گلِ تر اس قدر غمناک ہے
چشم پُر نم ہے جگر خوں ہے گریباں چاک ہے

چاند پر ناحق فنا کرتا ہے جان اپنی چکور
چاند کب سنتا ہے اس مہجور کے نالوں کا شور

مسکراہٹ چاند کی ہو اس کے نالوں کا جواب!
اُس طرف اتنا سکوں اور اِس طرف یہ اضطراب!

آتشِ اُلفت ہی برقِ خرمنِ پروانہ ہے
یہ پتنگا بھی ادائے شمع کا دیوانہ ہے

گرد پھر پھر کر طوافِ کعبۂ اُلفت کرے!
جان دے اور آتشِ ذوقِ فنا میں جل مرے!

شمع کو لیکن نہیں اس کی محبت کی خبر
وہ ذرا اس پر نہیں کرتی عنایت کی نظر

کونسی دُھن میں ہیں خدا جانے وُہ ہو آتش بجاں | کس لئے ہیں گرم آنسو اس کی آنکھوں سے رواں
جب محبت کا یہ عالم ہے تو کیا اس کی تلاش؟ | کیا تمنّائیں کہاں کی آرزو کس کی تلاش؟

عاشق از بے مہریِ یار جفا جو شکوہ سنج
یار در فرطِ ہوائے دیگرے پامالِ رنج

نیرنگ

مُرغ و صیّاد

اَے نسیم صُبح! اَے گہوارہ جنبانِ چمن | ہو اگر تیرا گذر سُوئے جوانانِ چمن
اُن سے کہنا میری جانب سے بصد اظہارِ شوق | ساتھ کے کھیلے ہُوئے ہیں جو یارانِ چمن
اِک گرفتارِ قفس نے ہے کہا تم کو سلام | اور پوچھا ہے مزاجِ سرو و ریحانِ چمن
پھر یہ دینا میری جانب سے نویدِ جانفزا | سیرِ گلشن ہو مُبارک تم کو مُرغانِ چمن
خاک اُڑا کر پہلے چُپ ہو جائیو بادِ صَبا | حال پُوچھیں کچھ جو میرا ہمعصیرانِ چمن
پھر یہ کہنا کھینچکر سینے سے آہِ جانگداز | ہے قفس میں قید وُہ مرغ خوش الحانِ چمن
اب نہ سیرِ لالہ و گل ہے نہ وُہ گلگشتِ بلغ | حسرتِ پرواز ہے اب اَور ارمانِ چمن
اب نہ وُہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کُنجِ خوشگوار | وُہ نہالانِ چمن ہیں اب نہ میدانِ چمن
تنکے چُنتا ہے پڑا کُنجِ قفس میں اب غریب | آشیاں کیسا! کہاں کی فکرِ سامانِ چمن

توڑتا ہے خانۂ صیّاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بُلبلِ تصویرِ ماتم ہائے ہائے

چھیڑتی ہے کیا قفس میں ہم کو اَے موجِ نسیم | اس چمن میں ہم بھی تھے پروردہ نازِ قدیم

تھی ہماری بھی کبھی سر سبز کشتِ آرزو
ہمپہ بھی اَے ابرِ رحمت! تھا ترا لطفِ عمیم

لُوٹتے تھے آہ دن کو سبزہ زاروں کے مزے
شب کو رہتے تھے تر و شاداب کُنجوں میں مقیم

یا چہکتے پھرتے تھے باغوں میں ہم اَے ہمصفیر
یا قفس میں چیختے ہیں آہ بے یار و ندیم

ہم کہاں کے خوشنوا تھے ہم کہاں کے بذلہ سنج
ہم پہ اَے صیّاد ٹُوٹا جو ترا قہرِ عظیم

ہمصفیرانِ چمن کے کیا تغافل کا گلہ
جب قفس میں پھنس گئے۔ کیسی رہ و رسمِ قدیم

ذبح اَے صیّاد کر بھی چک کر جھگڑا پاک ہو
ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حالِ سقیم

پھُونکدے اَے سوزِ غمہائے نہانی! پھُونکدے
نکلے او ظالم! بھڑک اُٹھ! شعلۂ نارِ جحیم

ہم ہیں پابندِ قفس۔ کیسا چمن کیسی بہار
کس کو مژدہ دینے آئی ہر تو اَے بادِ نسیم

دیدِ گُل سے واسطہ کیا ہم اسیروں کے لئے
سیرِ گلشن ہو مُبارک ہمصفیروں کے لئے

لالہ و گل کی بھی قسمت میں فضا دو چار دن
ہم نے کھالی سبزہ زاروں کی ہوا دو چار دن

پھر سُنیگا ہائے کس کے زمزمے صیّاد تو
ہم قفس میں اَور ہیں نغمہ سرا دو چار دن

حسرتِ پرواز بھی جاتی رہیگی اَے اجل!
ہم سے اُڑ لیں اَور مرغانِ ہوا دو چار دن

پھر کہاں صیّاد و ہم۔ اور پھر کہاں کُنجِ قفس
آب و دانہ ہے مقدّر میں ترا دو چار دن

گھُٹ کے اس زنداں میں جائیگا کبھی تو دم نکل
مانگتے ہیں اَے اجل! تری دُعا دو چار دن

یاد اَے صیّاد! ہم کو بھی کرے گا تو کبھی
اَور تڑپا لے قفس میں بیوفا دو چار دن

دیکھ کر خالی قفس کو جی بھر آئیگا ترا
پیٹ کر رو ئیگا سر۔ بعدِ فنا دو چار دن

کر رہے ہیں جس طرح ہم نالہائے دردناک
تو رہیگا یُونہی مصروفِ بکا دو چار دن

یاد جب صیّاد آئینگے ہمارے زمزمے
گھر میں تنہا تیرا جی گھبرائیگا دو چار دن

دستِ حسرت مَل کے اَے صیّاد! پچھتائیگا تُو
ایسا لائیگا کہاں سے آہ مرغِ خوش گلُو

جب بنائیگا ہمارا آہ ! چھوٹا سا مزار
چُپکے چُپکے تو ہمارے غم میں ہوگا اشکبار

یاد رہ رہ کر جفائیں اپنی آئینگی تجھے
اور ہماری بیکسی پر روئے گا تو زار زار

لے کے خالی گھر کو جب گلشن سے لَوٹیگا قفس
پیچھے پیچھے خاک اُڑاتی آئے گی بادِ بہار

سُنکے اَی صیّاد ! تیرے نالہائے جانگداز
راستے میں لوگ پُوچھینگے کہ کیوں ہے سوگوار

تو کہیگا مر گئی وُہ بُلبُلِ رنگیں نوا
وصلِ گل کے واسطے تھی جو قفس میں بیقرار

گل کھلینگے ۔ سبزۂ نورس اُگیگا قبر پر
ہم نہ ہونگے اور آئیگی گلستاں میں بہار

سوتے ہونگے تیرے گہوارے میں اَے کُنجِ لحد
خوابِ راحت میں مخل ہوگی نہ کلبانگِ ہزار

اپنی مٹّی ہم کہاں کی کیا خبر ۔ بادِ صَبَا !
ہو پریشاں دیکھئے کس کس جگہ مُشتِ غبار

وُہ بھی آزادی کے دن تھے ہائے کتنے جانفزا !
تیرے بندھن سے تھے جب اَے قیدِ ہستی رستگار

لوٹتے تھے اپنے گلشن میں بہاروں کے مزے
سبزہ زاروں کی تھیں سیریں ۔ جوئباروں کے مزے

ہم سرودِ طائرانِ قدس تھے ہم بھی صَبَا !
قیدِ ہستی کی کشاکش میں نہ تھے یُوں مبتلا

بولتے تھے اپنی دُھن میں پیاری پیاری بولیاں
ہائے وُہ دن ! شاخِ طُوبیٰ پر تھے جب نغمہ سرا

لوٹتے تھے ہم بہاریں گلشنِ فردوس کی
تھی عجب دلکش ہمارے سبزہ زاروں کی فضا

کھل رہے تھے چار سو پھولوں کے تختے خوشگوار
تھیں رواں شیر و عسل کی اُن میں نہریں جابجا

اپنے پھولوں پر تو اتراتی ہے کیا اَی عندلیب !
تُو نے دیکھی ہی نہیں ہے شاہدِ گُل کی ادا

کر کے ہم کو تو اسیرِ حلقۂ دامِ فریب
کھینچکر کس وادیٔ پُرخار میں لائی قضا

ہم نہ پھنستے کس طرح صیّاد تیرے جال میں
آب و دانہ تھا مقدّر میں ترے گھر کا لکھا

ہم قفس میں کب تلک بے بال و پر تڑپا کریں
ٹوٹ بھی جا ! اَے طلسمِ قیدِ ہستی ۔ ٹوٹ جا !

تیرے مُرغِ دست پرور ہم ہیں صیّادِ ازل !
خواہ ہم کو ذبح کر تو ۔ خواہ ہم کو کر رہا

سن نہ آں مُرغم کہ نالم از جفائے تیغ تو
ذبح کُن صیاد - قُربانِ ادائے تیغ تو

(سرُور جہان آبادی)

مُرغانِ قفس

تضمین

جو تجھ پہ بیتے تو تُو جانے مُرغِ بُستانی
قفس میں کیسے تڑپتے ہیں آہ زندانی
تپش فزا ہے قیامت کا دردِ پنہانی
تُو اَے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

اسیرِ دام نہ ہو کوئی مُرغِ بُستانی
خُدا کسی کو نہ دے حسرتِ پر افشانی
سمجھتا ہے مرے نالوں کو زمزمہ خوانی
تو اَے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

ہنسی نہ مجھ سے کر او محوِ زمزمہ خوانی
ہو کنگرے پہ مُبارک تجھے خوش الحانی
خُدا وہ دن نہ دکھائے کہ تو ہو زندانی
تو اَے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

سرور جہان آبادی

تازہ غزلیں

عید اور انتظارِ یار

کہتے ہیں عید ہے آج - اپنی بھی عید ہوتی ہم کو اگر میسّر جاناں کی دید ہوتی
قیمت میں دیدِ رُخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے بازارِ ناز لگتا دل کی خرید ہوتی
کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سُنتے ناز و نیاز کی یوں گفت و شنید ہوتی
جلوے دکھاتے جاتے وُہ طرزِ دلبری کے اور دل میں یاں ہوائے نازِ مزید ہوتی
تیغِ نظر سے دل پر وُہ وار کرتے جاتے اور لب پہ یاں صدائے ھَل مِن مَزِید ہوتی
ابرو سے اُن کے غمزہ تیرِ ادا لگاتا یہ دل قتیل ہوتا یہ جاں شہید ہوتی
کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لُطفِ جاناں کچھ دغدغہ سا ہوتا - کچھ کچھ امّید ہوتی
لیکن یہاں تو حرماں ہے ثمرۂ تمنّا کیوں قفلِ آرزو کی پیدا کلید ہوتی؟

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اُسکی اک جھلک کو
نیرنگِ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی؟

(نیرنگ)

سختیاں کرتا ہُوں دل پر غیر سے غافل ہُوں میں ہائے کیا اچھّی کہی ظالم ہُوں میں جاہل ہُوں میں
مَیں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں
اے تماشائی! مری پستی کا نظارہ تو دیکھ اسفلِ عالی نظر ہُوں ناقصِ کامل ہوں میں
علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست وائے محرومی! صدف چینِ لبِ ساحل ہُوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق
دل سے کہتا ہے جگر، تو دل نہیں ہے دل ہوں میں

ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جسکی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

تجھ میں پوشیدہ ہی لیلےٰ آدمی لیلےٰ کوئی
کہہ رہا ہے دل ترا لیلےٰ نہیں محمل ہوں میں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید ہی
پھونک ڈالی اپنی کھیتی آہ! کیا غافل ہوں میں

مَیں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دل صبحِ الست
اب نہ پہچانو تو تم جانو وہی بیدل ہوں میں

ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش
مجھ پہ آ کے گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں

بزمِ ہستی! اپنی آرایش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

تخم ریزی جسکی ہنگام صدائے کُن ہوئی
اس پرانی مزرعۂ زرخیز کا حاصل ہوں میں

جانتا ہوں جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز
سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

(اقبال)

جہاں سے جاتے ہیں اب جی کے ہارنے والے
کدھر چلے مرے گیسو سنوارنے والے

پلٹ کے دیکھ تو لیتا دیا تھا گر نہ جواب
حیا سے گڑ گئے تجھ کو پکارنے والے

کچھ ایک میں نہیں عشاق ہر طرح کے ہیں
سمجھ کے تیکھی نگاہوں سے مارنے والے

ہوا نہ ضبط سے بھی کوئی کام وا اسفا
پڑے ہیں خاک پر جی کو مارنے والے

نہ خم نہ جام نہ میخوار بزم ہے سنسان
غرض سدھار گئے سب سدھارنے والے

کچھ ایک گل نہیں تیری گلی میں اے فیاضؔ
ابھی بہت سے ہیں دامن پسارنے والے

کچھ اس طرح سے ستائے گئے گلی میں تری
پلٹ کے آئے نہ پھر جی کو مارنے والے

سمجھ کے تیری گذرگاہ دیدۂ غیر کے ہیں
حیا بھی ہار گئے دل کے ہارنے والے

بس اب جواب ملیگا یہی رہی اُمید — پکارتے رہے تجھ کو پکارنے والے
ذرا سی ٹھیس بھی شیشے کے واسطے ہے پہاڑ — سنبھل کے طاق سے مینا اُتارنے والے

بس اب ہو خیر ہی خیر اُن کے حُسن کی اے شاد
بلائیں لے کے چلے جان وارنے والے

(شاد)

ستائے خنجرِ قاتل نہ آرزو رہ جائے — میرے لہو کی قسم ہے جو آج تو رہ جائے
چھپی ہوئی ہے گُلِ تر میں رُوح بلبل کی — عجب نہیں ہے کہ مانندِ رنگ و بو رہ جائے
وُہ مستِ ناز جو آجائے میکدے کی طرف — خموش شیشے ہوں اور دم بخود سبو رہ جائے
کدھر سے اُنکا گذر ہو خدا کو ہے معلوم — اُڑانا خاک ہماری کہ چار سُو رہ جائے
نہ ہوگی بعد مرے اُن کو قدرِ آرائش — کروں سلام جو آئینہ رُوبرو رہ جائے
ترے ہی دم سے ہے سب کائنات دُنیا کی — بلا سے ہم نہ رہیں اس جہاں میں تو رہ جائے
بساطِ عیش اُلٹنے کی تاک میں ہے فلک — کسے یقیں ہے یہ محفل رہے سبو رہ جائے
مجھے بھی آج وہ مقتل میں سرفراز کریں — خدا کرے کہ شہیدوں میں آبرو رہ جائے
اگر یہ جذبِ شہادت نہیں تو پھر کیا ہے — وُہ دھوئیں خوب سا دامن کو اور لہو رہ جائے
خدا نہ شام مصیبت کی صُبح دکھلائے — اُٹھا لے پردۂ شب میں تو آبرو رہ جائے
وُہ اپنی تیغ زنی پر کمال نازاں ہیں — عجب مزا ہو جو ثابت رگِ گلو رہ جائے

سرشکِ غم سے تلاطم میں دل ہے اے سجاد
جو غرق ہو یہ سفینہ تو آبرو رہ جائے

سجاد (دہلوی عظیم آبادی)

مجرب اور مفید شرطیہ ادویات (۳۱) دسمبر ۱۹۳۴ء تک چوتھائی قیمت

ڈاکٹر نصیر صاحب سند یافتہ میڈیکل کالج لاہور کا تیار کردہ

اصلی نمک سلیمانی

اسکو استعمال کر کے بھوک کھل کر لگتی ہے سخت ثقیل جو کچھ کھاؤ فوراً ہضم ہو جاتا ہے۔ درد شکم کھٹی یا جی ڈکاروں کا آنا۔ ہاضمہ کو قوت بدن کا گرم ہونا۔ اسہال پیچش۔ درد جگر۔ درد سر ضعف جگر تبخیر اور سوزش دل وغیرہ تمام امراض کو دفع کرتا ہے اکسیر ثابت ہوا ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے اور خون کی خرابی سے جو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ اُن سے نجات دیتا ہے۔ ہیضہ کے لئے تریاق کامل ہے۔ اگر بطور حفظ ما تقدم استعمال کیا جاتا تو بھوک زیادہ لگنے کی وجہ سے غذا بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ آدمی خاصہ پہلوان بنجاتا ہے۔ اصل قیمت فی ڈبیہ دو روپے (عہ)

رعائتی قیمت " آٹھ آنے (۸ر)

جوہر عشبہ

عشبہ سے بڑھ کر مصفی خون دوائی دنیا میں کوئی نہیں۔ یہ عشبہ ...سادات خون۔ خون اور پھوڑے ...کا مجرب علاج ہے۔ یہ عشبہ ...ب خون صاف کرکے ...ص خون پیدا کرتا ہے۔

اصل قیمت تین روپے (سے)

...ائتی قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

ممیرے کا سرمہ

یہ سرمہ ضعف بصارت۔ تاریکی چشم دھند۔ جالا۔ پڑوال۔ پھولا۔ سرخی پانی بہنا اور خارش چشم کیلئے شرطیہ مفید ہے۔ طالب علموں اور قانون پیشہ اصحاب یا ایسے اشخاص جنکو آنکھوں سے زیادہ کام لینا پڑتا ہو۔ وہ اس سرمہ کو بطور حفظ ما تقدم ہر روز استعمال کریں۔

اصل قیمت (سے) رعائتی (۱۲ر)

مونچھیں لمبی اچھی یا چھوٹی

پہلے آپ ایسے شخص کا چہرہ تصور میں لائیں جسکی مونچھیں چھوٹی ہوں پھر اُس چہرے پر بڑی مونچھوں کا تصور کرو۔ تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ چھوٹی مونچھوں والے مرد کا چہرہ کیسا بدنما اور بیہودہ معلوم ہوتا ہے۔ اور بڑی مونچھوں والے شخص کا چہرہ کیسا بارعب اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ پس آپ ہمارا تیار کردہ مونچھ بڑھانے کا تیل جلد منگوالیں +

اصل قیمت فی شیشی دو روپے (عہ)

رعائتی قیمت " آٹھ آنے (۸ر)

دانتوں کا منجن

دانتوں کی بدبو کو دور کرتا ہے اور دانتوں کے درد سے محفوظ رکھتا ہے۔ دانت خدا کے فضل سے مضبوط ہو جاتے ہیں۔

اصل قیمت فی بکس (عہ)

رعائتی قیمت چار آنے (۴ر)

...ایسر کی گولیاں

...بواسیر بادی۔ مسوں کا درد ...جانا وغیرہ بفضل خدا ایک ہی ...یوم میں فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ گولیاں بواسیر کے لئے حکمی علاج ہے۔

اصل قیمت دو روپے (عہ)

رعائتی آٹھ آنے (۸ر)

درخواستیں بنام حکیم ایم الیس پیرزادہ پروپرائیٹر شفاخانہ آفتاب حکمت لاہور آنی چاہئیں

علم الاقتصاد

(یعنی سیاستِ مدن)

مصنفہ شیخ محمد اقبال ایم۔اے۔ اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

ہم ناظرینِ مخزن کو بڑی خوشی سے اطلاع دیتے ہیں کہ یہ قابلِ قدر کتاب جسکا ایک باب ہدیۂ ناظرین ہوچکا ہے چھپکر تیار ہوگئی ہے۔ جس عرق ریزی سے شیخ صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے اور جس محنت سے اُنہوں نے علم الاقتصاد کے دقیق اصول کو واضح کیا ہے اسکا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکو علمی کتابوں کے پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ توضیحِ اصول کے ساتھ ساتھ مصنّف نے ہندوستان کے موجودہ تمدنی اخلاقی اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارات کئے ہیں جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اسکو مسائلِ اقتصاد پر آزادانہ طور پر غور وفکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ زرِ نقد کی ماہیت پر جو کچھ لکھا ہے ایک خاص منطقیانہ دلچسپی رکھتا ہے جس سے ایک عقلی مسرت حاصل ہونے کے علاوہ بعض اہم مسائل پر عجیب قسم کی روشنی پڑتی ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اُردو لٹریچر کا یہ قابلِ قدر اضافہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا اور اسکے مسائل پر کما حقہٗ غور کیا جائیگا کیونکہ ہندوستان کی آیندہ قسمت کا دارومدار زیادہ تر اس ملک کے موجودہ اقتصادی حالات پر منحصر ہے۔ اب وقت اس بات کا مقتضی ہے کہ پبلک کم وزنی لٹریچر سے دست بردار ہو کر ان کتابوں کی طرف توجہ کرے جنکا موضوع انسان کی علمی زندگی اور اس کے تمدنی حالات پر غور کرنا ہے۔ اس کتاب کی **قیمت** صرف ایک روپیہ (عہ) ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے۔

ایڈیٹر